جب اس ابتلا سے بھی آپؑ کے پائے استقلال میں تزلزل پیدا نہ ہوا تو شیطان نے آپ کو اس طرح بہکانے کی کوشش کی جیسے اس نے حضرت حوّاؑ کے ذریعے سے حضرت آدمؑ کو بہکایا تھا، لیکن آپ اس کی چال کو سمجھ گئے اور قسم کھائی کہ اگر آپ کی بیوی نے شیطان کی بات پر کان دھرا تو آپ اسے پیٹیں گے۔ بالآخر حضرت جبریلؑ یہ بشارت لائے کہ آپؑ ایک کراماتی چشمے کے ذریعے ابتلا سے نجات پائیں گے [اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ـ ۳۸ [صٓ]: ۴۲]؛ چنانچہ آپؑ نے اس کا پانی پیا، اس میں غسل کیا اور شفایاب ہوے۔ آپؑ کا مال، آپؑ کی جائداد، آپؑ کے بچے پہلے سے دوچند ہوکر آپ کو واپس مل گئے۔ اسی مقام پر جہاں آپ نے اپنی زندگی بسر کی تھی تہتّر [بقول الطبری ۹۳] سال کی عمر پا کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ بعض مفسّرین کو اس بات سے الجھن محسوس ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو یہ اجازت کیوں دی کہ وہ اس کے ایک نیک بندے کو اس طرح تکلیف میں مبتلا کرے اور انھوں نے اس کی مختلف تاویلات پیش کرنے میں بہت سعی و اہتمام سے کام لیا ہے۔

روایت ہے کہ آپ سلسلۂ انبیا میں حضرت یوسفؑ کے بعد مبعوث ہوے۔ [ایک قول ہے کہ آپؑ حضرت سلیمانؑ کے بعد ہوے، روح المعانی]۔ ابن الکلبی نے آپ کو حضرت یونسؑ کے بعد رکھا ہے۔ آپؑ صاحبِ رسالت تھے اور آپؑ نے بمقام حوران اپنی قوم میں دینِ حق کی تبلیغ فرمائی۔ [سِفْرِ ایوب میں ہے کہ آپ عُوص کے علاقے میں رہتے تھے۔ جملہ جغرافیائی معلومات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ عرب میں ہوگا۔ غالباً یہ وہی مقام ہوگا جو قوم عاد کا مسکن تھا۔] روایتوں میں ہے کہ جب لوگوں کے مختلف گروہ جنّت میں داخل ہو رہے ہوں گے تو وہ ''صبر کرنے والوں'' کے سردار ہوں گے۔ المسعودی (مُرُوج، ۱:۹۱) نے لکھا ہے کہ [۳۳۲ھ میں] دمشق کے نزدیک نوٰی میں آپ کا مقبرہ زیارت گاہِ خاص و عام تھا۔ یہاں وہ چٹان اب تک دیکھی جاسکتی ہے جہاں بیٹھ کر آپ نے زمانۂ ابتلا بسر کیا تھا اور وہ چشمہ بھی جس میں غسل کر کے آپ نے شفا پائی تھی (قب نیز یاقوت [: معجم البلدان]، ۲: ۶۴۵)؛ [علالت و ابتلا کے زمانے میں حضرت ایوبؑ نے جس صبر و تحمّل کا ثبوت دیا اس سے صبرِ ایوب کی ترکیب نکلی جو ادب میں بطور ضرب المثل رائج ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جب محمد بن قاسم نے ملتان کو فتح کیا تو اس وقت وہاں کے بڑے مندر کا بت حضرت ایوبؑ کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا (البلاذری: فتوح، ۴۴۰)۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے بشر ذاالکِفل کے لقب سے نبی مبعوث ہوے۔]

مآخذ: (۱) تفاسیر قرآن بر ۲۱ [الانبیآء] و ۳۸ [صٓ]؛ مثلاً ابن جریر، ابن کثیر، الرّازی، ابن حیان، آلوسی، تھانوی وغیرہ؛ (۲) الطّبری: تأریخ، ۱:۳۶۱-۳۶۴؛ (۳) الثّعلبی: قَصَص الانبیاء، قاہرہ ۱۳۳۹ھ، ص ۱۰۶-۱۱۴؛ (۴) الکِسائی [: کتاب بدء خلق الدنیا و قَصَص الانبیاء] (طبع Eisenberg، ص ۱۷۹-۱۹۰)؛ (۵) ابن عساکر: التأریخ الکبیر، ۳:۱۹۰-۲۰۰؛ (۶) ابن الکثیر: البدایۃ و النِہایۃ، ۱:۲۲۰-۲۲۵؛ (۷) منسوب بہ بلخی: *Le Livre de la Creation* (طبع Huart)، ۳: ۷۲-۷۵؛ (۸) M. Grünbaum: *Neue Beiträge zur semiti-schen Sagenkunde*، ص ۲۶۲ بعد؛ (۹) D. Sidersky: *Origines des légendes musulmanes*، ص ۶۹-۷۲؛ (۱۰) J. Horovitz: *Kora-nische Unterschungen*، ص ۱۰۰-۱۰۱؛ [(۱۱) ابوالفداء: تأریخ، ۱:۱۶؛ (۱۲) جواد علی: تاریخ العرب قبل الاسلام، ۲: ۳۵۳؛ (۱۳) الاعلام، ۱: ۳۷۹، ۳۸۰، (۱۴) جورج پوسٹ: قاموس الکتاب المقدس، ۱:۱۸۸-۱۹۱].

(A. JEFFERY [و ادارہ])

ایّوب خاں: امیرِ افغانستان شیر علی خاں کا چوتھا بیٹا اور [امیر] یعقوب* خاں کا حقیقی بھائی۔ افغانستان کے اکثر امیروں کی طرح شیر علی خاں کو بھی اپنے بیٹوں کے معاملے میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا؛ چنانچہ جب ۱۸۷۳ء میں اس نے اپنے چہیتے بیٹے عبداللہ جان کو اپنا ولی عہد نامزد کیا تو ایّوب خاں بھاگ کر ایران چلا گیا۔ ۱۸۷۹ء میں جب یعقوب خاں نے امیر کی حیثیت سے تخت سنبھالا تو ایوب خاں افغانستان لوٹ آیا اور ہرات کا والی مقرر ہوا۔ دوسری جنگِ افغانستان (۱۸۷۸-۱۸۸۰ء) کے خاتمے کے قریب لارڈ لِٹن (Lytton) کی حکومت نے سدوزئی خاندان کے ایک شاہزادے شیر علی کو قندھار کا والی منتخب کیا۔ ایوب خاں نے اسے قندھار سے نکال باہر کیا اور ساتھ ہی ۲۷ جنوری ۱۸۸۰ء کو مَیُوند کے مقام پر جنرل بروز (Burrows) کے زیرکمان برطانوی فوج کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس بگڑی ہوئی صورتِ حال کو سر فریڈرک رابرٹس (بعد ازاں لارڈ رابرٹس) نے سنبھالا؛ چنانچہ وہ بڑی تیزی کے ساتھ کابل سے قندھار کی طرف بڑھا اور ایوب خاں کی فوج کو شکست دے کر اسے ہرات کی طرف پسپا ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ جب عبدالرحمٰن خاں امیرِ کابل بنا تو اس نے سب سے پہلے اس بات کا عزم کیا کہ وہ پورے ملک پر اپنا تسلط قائم کرے۔ جولائی ۱۸۸۱ء میں ایوب خاں نے، جو ہرات پر قابض تھا، عبدالرحمٰن خاں کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا، کیونکہ اسے برطانیہ نے نام زد کیا تھا، اور قندھار پر قبضہ کرلیا؛ لیکن ۱۸۸۱ء کے اواخر میں عبدالرحمٰن کے ہاتھوں شکست فاش کھائی۔ پھر ہرات سے بھی نکال دیا گیا اور اسے مجبوراً مشہد (ایران) میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ ۱۸۸۷ء میں غلزئیوں کی بغاوت ہوئی تو ایوب خاں نے ایک بار پھر کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن شکست کھائی اور دوبارہ ایران چلا گیا۔ بعد ازاں وہ ہندوستان چلا آیا اور وفات (۱۶ اپریل ۱۹۱۴ء) تک اس نے زندگی کے باقی ایام لاہور میں گزارے۔ [جب تک ایوب خاں لاہور میں رہا زندگی اِس انداز میں گزاری کہ سب لوگ اس کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ عیدین کی نمازیں فرزندوں کے ساتھ شاہی مسجد میں ادا کرتا اور اس موقع پر امام کو خلعت بھی دیتا۔ جنگِ بلقان میں خاصا مال، جس میں گھوڑے بھی شامل تھے، ترکوں کی امداد کے لیے دیا۔ مرنے سے پیشتر وصیت کر دی تھی کہ اسے پشاور میں دفن کیا جائے، چنانچہ اس وصیت کی تعمیل ہوئی اور اسلامیہ کالج کی وسیع گراونڈ میں ہزاروں مسلمان نمازہ جنازہ ادا کر چکے تو میت ٹرین پر

سوار کر کے پشاور لے گئے].

مآخذ: (۱) گوپال (S. Gopal): *The Viceroyalty of Lord Ripon*، ۱۹۵۳ء؛ (۲) S. M. Khan: *Life of Abdur Rahman*، ۱۹۰۰ء؛ (۳) رابرٹس (Lord Roberts): *Forty-one-Years in India*، ۱۸۹۷ء.

(C. COLLIN DAVIES)

---

* **اَیُّوب خاں:** (محمد اَیّوب خاں) رک بہ پاکستان.

---

* **اَیّوب صَبْری پاشا:** سلطنت عثمانیہ [ترکیہ] کی بحری فوج کا ایک افسر اور ادیب۔ وہ بحری مدرسۂ عالیہ کا اعلیٰ سند یافتہ تھا، مختلف عہدوں پر فائز رہا اور کچھ عرصہ حجاز و یمن میں بھی گزارا۔ بلادِ عرب کی تاریخ اور وہاں کے حالات میں اس کی متعدّد تصنیفات ہیں۔ جن میں مِرآۃ الحَرَمین (مکّہ و مدینہ کے حالات)، ۳ جلد، استانبول ۱۳۰۱ - ۱۳۰۶ء، اور تاریخ وھابیان، استانبول ۱۲۹۶ھ، بھی شامل ہیں۔ علاوہ بریں اس نے محمود السِّیر کے نام سے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ایک سیرت (اور نہ ۱۲۸۷ھ) بھی لکھی ہے.

مآخذ: (۱) Babinger، ص ۳۷۲ - ۳۷۳؛ (۲) سجِلِّ عثمانی، ۱: ۴۵۱؛ (۳) عثمانلی مؤلّفلری، ۳: ۲۶-۲۷.

(B. LEWIS)

---

* **اَیّوب، نَجْم الدّین شاذِی:** رک بہ اَیُّوبیہ (بنو اَیّوب).

---

* **اَیُّوب، نَجْم الدّیْن المَلِکُ الصّالِح:** رک بہ اَیُّوبیہ (بنو اَیّوب).

---

* **ایّوبیّہ:** بنو اَیّوب، ایک شاہی خاندان، جس کا بانی [سلطان] صلاح الدینؒ بن ایّوب تھا اور جو چھٹی/بارھویں صدی کے اواخر اور ساتویں/تیرھویں صدی کے اوائل میں مصر، شام، اسلامی فلسطین اور بین النہرین کے بالائی حصے (الجزیرہ) اور یمن پر حکمران رہا.

[نجم الدین] ایّوب بن شاذی بن مروان [(ابن خلّکان، ۲: ۱۴)؛ ابن خلدون (۵: ۲۲۰) نے سولہ پشتوں تک کا نسب نامہ دیا ہے]، جس کی نسبت سے یہ خاندان ایّوبی مشہور ہوا، ارمینیا کے ایک گاؤں اَجْدَ نَقان، نزد دَوِین (دَبِیل)، میں پیدا ہوا اور ہذبانی کُردوں کی شاخ رَوّادی سے تھا۔ چھٹی/بارھویں صدی کے اوائل میں ایوب کا والد شاذی خاندان شدّادیہ کا ملازم تھا۔ [ابن خلّکان نے اس کے متعلّق یہ الفاظ استعمال کیے ہیں: من اھلِ دَوِیْن و من ابناء اعیانھا و المعتبرین بھا (تحت مادّۂ ایوب)، یعنی ایوب دَوِین کا باشندہ تھا، اس کے آبا و اجداد اشراف اور معتبر لوگ تھے۔ اس کے والد شاذی کا انتقال تکریت میں ہوا (ابن کثیر، ۱۲: ۲۷۰) اور وہ وہیں مدفون ہے۔] شدّادی خاندان بھی کُرد نسل کا تھا، جسے سلجوقی سلطان آلپ ارسلان نے سابقہ صدی کے وسط میں اس علاقے کی حکومت سونپی تھی۔ آہستہ آہستہ ترکوں نے تمام کُرد امیروں اور فرماں رواؤں سے اُن کا اقتدار چھین لیا اور ان میں سے کئی ایک نے اس ڈر سے کہ کہیں سب کچھ ہاتھ سے نہ جاتا رہے ترکوں کی ملازمت اختیار کر لی، جن کے ساتھ وہ اپنے سُنّی عقائد اور ذوقِ جدال و قتال کی بنا پر اک گونہ یگانگی محسوس کرتے تھے۔ جب خاندان شدّادیہ کے ہاتھ سے دوین نکل گیا (۵۲۴ھ/۱۱۳۰ء) تو شاذی عراق میں سلجوقیوں کے فوجی گورنر [جمال الدولۃ مجاہد الدین] بہروز [شحنۂ بغداد] کے حلقۂ ملازمت میں شامل ہو گیا۔ بہروز کو تکریت جاگیر (اقطاع) میں ملا تھا، چنانچہ اس نے شاذی کو اس شہر کا والی مقرر کر دیا۔ [یہیں صلاح الدین ایوبی ۵۳۲ھ میں پیدا ہوا۔] تھوڑے ہی عرصے بعد شاذی کے بیٹے ایّوب کو جانشین کی حیثیت میں یہی عہدہ مل گیا ([ابن کثیر، ۱۰: ۲۴۲، ۱۲: ۲۷۱؛ نیز] مِنوَرسکی (V. Minorsky): *Pre-history of Saladin*، در *Studies in Caucasian History*، کیمبرج ۱۹۵۳ء، ص ۱۰۷-۱۲۹)۔ اسی حیثیت میں اس نے موصل اور حَلَب کے اتابک [عماد الدین] زنگی [م ۵۴۱ھ] کو ممنونِ احسان کیا، یعنی جب زنگی کو خلیفۂ وقت کے ہاتھوں شکست ہوئی تو وہ ایّوب کی مدد سے دریائے فرات عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس طرح تباہی سے بچ گیا۔ موصل کے عقبی علاقے میں زنگی نے باضابطہ طور پر یہ حکمت عملی اختیار کی کہ پہلے تو کُردوں کو مطیع کیا جائے اور پھر انھیں فوج میں بھرتی کر لیا جائے [ابن الاثیر (۱۱: ۴۲)] نے عماد الدین کی بہت سی خوبیاں گنوائی ہیں۔ اُس کی دور اندیشی، معاملہ فہمی اور ضبط و نظم اور تدبّر کی مثالیں دی ہیں۔ عماد الدین نے اس وقت کے مسلمانوں کی ایسے نازک وقت میں قیادت و حفاظت کی جب برِاعظم یورپ کے عیسائی مل کر انھیں ختم کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ ۵۳۲ھ/۱۱۳۸ء میں ایّوب نے بہروز سے علٰیحدگی کے بعد عماد الدین کی ملازمت اختیار کر لی، جس نے اسے فوراً ہی شام بھیج دیا اور بَعْلَبَک کا، جو دمشق کے بالمقابل واقع ہے، والی مقرر کر دیا۔ نجم الدین ایّوب نے علاقے کو ترقی دی اور عوام کو خوش حال کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عباسی خلیفہ المُقتفی لِامر اللہ (م ۵۵۰ھ) نمائشی تاجدار تھا]۔ زنگی کی وفات کے بعد ایوب نے دمشق کے فرماں روا کی اطاعت قبول کر لی، جو خاندان بُوریّہ سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے اسے اس شہر کا والی بنا دیا۔ اس کا بھائی [اسد الدین] شِیرکوہ، زنگی کے بیٹے نور الدین [۵۱۱-۵۶۹ھ] کے ساتھ ہو گیا، جو شمالی شام کا فرماں روا تھا اور اس نے حِمْص بطور اقطاع (= جاگیر) دے دیا۔ دمشق کی رائے عامّہ کے رجحان کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام کا پورا اسلامی علاقہ سب سے زیادہ طاقت اور جوشِ جہاد رکھنے والے امیر نور الدین زنگی کے ماتحت متحد ہو گیا تاکہ فرنگیوں کے خلاف زیادہ مؤثّر طریقے پر جنگ کی جا سکے۔ سقوطِ دمشق کے ضمن میں جو سرگرمیاں ظہور میں آئیں ان میں ان دونوں بھائیوں یعنی شیرکوہ اور ایّوب کا بہت بڑا حصہ تھا۔ ایّوب نے نور الدّین کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا، جو شام کے دار الحکومت کا والی

تھا۔[ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ خلفاے راشدینؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد اس وقت تک کے بادشاہوں میں نورالدین جیسی اچھی سیرت اور پاکیزہ اخلاق کا کوئی دوسرا فرماں روا نہیں دیکھا گیا۔ ابن الاثیر نے نورالدین کی سیرت پر اپنی کتاب الباھر میں بحث کی ہے اور یہی معیار صلاح الدین کے پیش نظر تھا]۔

یہاں ان خدمات کا بالتفصیل ذکر کرنا ممکن نہیں جو شیرکوہ نے نورالدّین کی ملازمت میں سرانجام دیں۔ اس خاندان کا ستارہ اس وقت چمکا جب نورالدّین نے شیرکوہ کو اس کی مرضی کے خلاف [پہلی دفعہ ۵۵۸ھ میں] مصر پر لشکرکشی کے لیے سپہ سالار منتخب کیا۔ یہ لشکرکشی نورالدّین نے مِصر [کے فاطمی خلیفہ العاضد] کے وزیر شاور کی درخواست پر اس کے مخالفین کے خلاف کی تھی۔ جنگ کئی برس تک شدت کے ساتھ جاری رہی اور شِیرکُوہ فتح یاب ہوا۔[اس کے بعد عیسائیوں سے ایک معاہدے کے مطابق اس نے مصر خالی کر دیا، لیکن ان کی بے مروتیوں کی وجہ سے اسے دوبارہ حملہ آور ہونا پڑا (ابن الاثیر، ۱۱:۱۳۱)۔ مِصر پر شیرکوہ کے تیسرے حملے کے وقت بھی صلاح الدّین اپنے چچا کے ہمراہ تھا۔ مصر پر اس تیسرے حملے کے اسباب بیان کرتے ہوئے لین پُول نے اعتراف کیا ہے کہ اس حملے کی نوبت اس لیے آئی کہ عیسائیوں نے غدّاری کی تھی اور مصر پر ایک بڑی فوج چڑھا لے گئے تھے، جس کا محرّک قبرص کا عیسائی بادشاہ تھا (نیز دیکھیے ابن الاثیر، ۱۱:۱۲۶)۔ اس حملے میں شیرکوہ نے پھر فتح پائی۔ شاوَر بن مُجیر، جو ۵۵۸ھ میں منصبِ وزارت پر بیٹھا تھا، قتل ہوا اور شیرکوہ وزیر بنا۔ اس واقعے کے چند ہی ہفتے بعد ملک منصور امیر الجیوش شیرکوہ وفات پا گیا (۲۲ جمادی الاُخریٰ ۵۶۴ھ/ ۱۱۶۹ء) اور اس کے بھتیجے صلاح الدین بن ایوّب نے، جو اس کے ساتھ تھا، فاطمی خلیفہ کے ایما سے فوراً اس کا عہدہ سنبھال لیا اور مصر پر قابض افواج نے اُسے شیرکوہ کا جانشین تسلیم کر لیا اور فاطمی خلیفہ العاضد نے اسے الملکُ الناصر کا خطاب دیا۔ اس وقت صلاحُ الدین کی عمر بتیس سال کی تھی]۔

صلاح الدّین (جسے یورپ والے Saladin کہتے ہیں) اس خاندان کا حقیقی بانی تھا۔ اس [عظیم الشان خادم اسلام] خاندان کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: (۱) خود صلاح الدین کا دَور، جو دراصل تشکیل وتعمیر کا دَور تھا اور جس پر اس کی شخصیت کی مُہر ثبت ہے۔ شخصیت کے اعتبار سے وہ اپنے خاندان میں سب سے زیادہ زبردست تھا، گو بہت سے امور میں اس کے جانشینوں کی حکمت عملی اس کے خلاف رہی؛ (۲) اس کے ابتدائی جانشینوں کا دَور، جو تنظیم کا دَور تھا اور الملک الکامل کی وفات (۶۳۵ھ/ ۱۲۳۸ء) تک جاری رہا؛ (۳) آخری دَور، جسے ایک طویل دَورِ انحطاط وزوال کہا جاسکتا ہے۔ یہ مناسب ہوگا کہ دوسرے دَور کے ذیل میں ہم ان تمام مسائل کو زیر مطالعہ لے آئیں جن کا تعلق اندرونی تنظیم سے تھا اور جو اس حکومت کے پورے عہد میں مشترک نظر آتے ہیں۔

(۱) صلاح الدین کے عہدِ حکومت کی مفصّل تاریخ یہاں بیان نہیں کی جاسکتی یہاں صرف یہ کوشش کی جائے گی کہ وہ پہلو واضح کر دیے جائیں جو بعد کے عہد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں اور جن کا خیال بنو ایوّب کا ذکر کرتے ہوئے بالخصوص ہمارے ذہن میں آتا ہے۔

گوشیرکُوہ اور صلاح الدین کو مصر میں اقتدارِ حکومت تقریباً اسی انداز سے حاصل ہوا جس سے ان کے پیشرو دَورِ فاطمیہ کے وزیروں کو حاصل ہوا تھا، یعنی خلیفہ العاضد نے سندِ حکومت عطا کر کے اُن کے اقتدار پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ اُس قدیم عسکری روایت کے نمائندے تھے جو انھوں نے آلِ سلجوق سے ورثے میں پائی تھی اور اس زمانے میں ایشیا کے اسلامی ملکوں کے تمام تُرک فرماں رواؤں میں کم وبیش قدرِ مشترک کا درجہ رکھتی تھی اور جو نورالدّین کی صورت میں بالخصوص مجسّم ہو کر ہمارے سامنے آ گئی تھی۔ ۵۶۶ھ/ ۱۱۷۱ء میں صلاح الدّین نے محسوس کیا کہ وہ خلافتِ فاطمیہ کو ختم کر کے ایک بار پھر مصر کو ان ریاستوں کی صف میں شامل کر سکتا ہے جو بغداد کے خلفاے عباسیہ کی سیادت تسلیم کرتی تھیں، چنانچہ دوصدی کے بعد پہلی مرتبہ مصر میں سُنّی مذہب پھر سرکاری مذہب قرار پایا۔ حقیقت یہ ہے کہ مصر کے اکثر باشندوں نے فاطمیوں کے اسمٰعیلی مذہب کو کبھی قبول نہیں کیا تھا، چنانچہ ان عناصر نے جنھیں حکومت کے ساتھ گہری وابستگی تھی جو ایک حد تک اپنی اصل کے اعتبار سے غیرملکی تھے، بغاوتیں برپا کر کے اپنا کھویا ہوا مرتبہ حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن عوام نے نئی حکومت کو اسی خاموشی سے قبول کر لیا جس سے اس کی پیشرو حکومت کو قبول کیا تھا۔ [۵۶۷ھ کے ابتدا ہی میں محرّم کے پہلے جمعے میں المستضیٔ بامراللہ عبّاسی کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور اس زمانے میں آخری فاطمی خلیفہ عاضدلدین اللہ کی وفات پر مِصر سے فاطمی خلافت کا دوسو سالہ عہد ختم ہو گیا اور سلطان صلاح الدّین نے حرم شاہی کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور محلّات کی دولت بیت المال میں جمع کر دی، اس کا ایک حبّہ بھی خود نہیں لیا، نہ فاطمی محلّات میں سکونت ہی اختیار کی]۔

صلاح الدّین کو پہلے فاطمی خلیفہ نے اور پھر عباسی خلیفہ نے حکومت سے سرفراز کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ نورالدّین کا باج گزار بھی تھا۔ نورالدین کے جانشینوں کے باہمی اختلافات اور ان کی کمزوری کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ پڑوس کی غالب عسکری قوت، جو گزشتہ پچاس سال سے شمالی شام میں مرکوز تھی، اب مِصر منتقل ہو گئی۔ ایک طرف تو جہاد کا وہ لائحۂ عمل جس نے نورالدّین کو وقار اور قوّت بخشی تھی اس کے جانشینوں نے ترک کر دیا اور دوسری طرف صلاح الدّین نے اس تصوّر کو اپنا لیا (H. A. R. Gibb: *The Achievement of Saladin*، در *Bull. of the John Rylands Library*، ج ۳۵، شمارہ ۱ (۱۹۵۲ء): ص ۴۶-۶۰)۔

[نورالدّین زنگی کی درخواست پر صلاح الدّین نے اس کے بیٹے الملک الصالح اسمٰعیل کی سیادت تسلیم کر لی، جس کی عمر گیارہ سال تھی۔ اپنے تمام مقبوضات میں نورالدّین کی جگہ اس کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اس کے نام کے سکّے ضرب کروائے۔ آہستہ آہستہ] اس نے متحدہ اسلامی عساکر کی سپہ سالاری کو سنبھالا، رائے عامّہ کی حمایت حاصل کی [اور محروسات نوریہ کی حفاظت کی۔ ہر چند کہ

صلاح الدین دمشق اس لیے نہیں آیا تھا کہ ملک الصالح کو معزول کر دے تاہم بعض حاسد اہل کاروں کی انگیخت سے الملک الصالح کے طفلانہ جذبات نے بے راہ روی اختیار کر لی۔ اس کے عہد کے بارے میں ابن کثیر نے بڑے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ دشمنوں نے ہر جانب سے مسلمانوں پر یلغار کر دی اور فرنگی دمشق فتح کرنے کے ارادے سے نکل کھڑے ہوے، بلکہ بانیاس پر انھوں نے حملہ کر بھی دیا (ابن خلدون، ۵: ۲۵۴)۔ آخر الملک الصالح کھلم کھلا صلاح الدین کے مقابلے میں نکل آیا، لیکن بالآخر صلح کر لی، جس کے مطابق الملک الصالح کا نام خطبے سے نکال دیا گیا۔ صلاح الدین نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا؛ پھر اسے خلیفۂ بغداد کی طرف سے خلعتِ فاخرہ، سیاہ جھنڈا اور مصر و شام کی حکومت کی سند بھی مل گئی۔ ربیع الاوّل ۵۷۲ھ میں سلطان مصر واپس چلا گیا، جہاں سے وہ ۵۷۸ھ میں پھر شام آیا تاکہ صلیبیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حفاظت کرے۔ ۷ صفر ۵۷۸ھ کو دمشق پہنچا۔ صلاح الدین جب مصر سے گیا تھا تو وہ مصر کا محض محکوم وزیر تھا اور جب مصر لوٹ رہا تھا تو مصر، شام و عراق میں اس سے بڑی قوّت کوئی اَور نہ تھی۔] وہ اپنی ایک ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اس نے اس ریاست کے تمام علاقے کو ایک بار پھر ایک دوسرے کے ساتھ ملحق کر لیا تھا اور اپنے پیشرو کی سلطنت کو پھیلانے کے علاوہ اسے پہلے سے کہیں استحکام بخشا تھا۔ یہ سب کچھ اس مختصر سے دَور میں رونما ہوا جس کے دوران میں اس کا ستارۂ اقبال اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ ۱۱۸۳ء تک کام مکمل ہو چکا تھا۔ اسی زمانے میں صلاح الدّین کے اقارب نے یمن میں اور اس کے ایک سپہ سالار قَرَہ قُوش نے تُونس کی سرحدوں پر اپنی ریاستیں قائم کر لی تھیں۔

اس طرح قوت حاصل کرنے کے بعد صلاح الدّین اس قابل ہو گیا [کہ اسلام کا دفاع کر سکے]۔ اس نے یروشلم کے مسیحی حکمرانوں کو فلسطین اور شام سے بے دخل کر دیا۔ معاصرین اور آنے والی نسلوں کی نظروں میں اسے جو عظمت اور شان و شوکت حاصل ہوئی وہ اسی شان دار کامیابی کی مرہونِ منت ہے۔ ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں اس نے حطّین کے مقام پر فرنگیوں کو کچل ڈالا، جس کے نتیجے میں اسّی سال کے بعد بیت المقدس پر ایک دفعہ پھر اسلامی پرچم لہرانے لگا۔ [اس موقع پر عیسائیوں پر سلطان صلاح الدّین کے احسانات کی فہرست طویل ہے۔] لین پول (ص ۲۰۲) اس موقع پر سلطان کی عظمت اور عالی ظرفی کی تعریف کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس موقع پر کوئی ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہ آیا کہ کسی عیسائی شہری پر زیادتی کی گئی ہو (اس موقع پر سلطان کی رواداری اور حسن سلوک کے لیے دیکھیے ابن کثیر، ص ۳۲۳؛ ابن خلدون، ص ۳۰۹؛ ابن الاثیر، جلد ۱۱)۔ سلطان کا یہ سلوک ان لوگوں کے ساتھ تھا جو اس سے پہلے ستّر ہزار سے اُوپر جانیں اپنی بربریت کی نذر کر چکے تھے۔

سٹیفن خلیفۃ المسلمین کے نام صلاح الدین کا ایک خط نقل کرتا ہے، جس میں صلاح الدین نے لکھا: ''ہم اس بچے کی حفاظت کریں گے جو اپنے باپ کے بعد تخت پر بیٹھا ہے (یعنی الملک الصالح)۔ ہم اس کے حق میں ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہوں گے جو اس کے نام سے دنیا سمیٹ رہے ہیں اور اپنے آپ کو اس کا وفادار ظاہر کر رہے ہیں حالانکہ اس پر ظلم کر رہے ہیں۔'' غرض صلاح الدّین، الملک الصالح کی حکومت کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ مملکت کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے پاک کر دے؛ چنانچہ اس مقصد کو اس نے بحسن و خوبی پورا کیا۔ شام میں اس کی اس واپسی سے دراصل اس کی زندگی کا دوسرا دَور شروع ہوتا ہے، جس میں اس نے فرنگیوں کے مقابلے کے لیے مسلمانوں کو متحد کیا]۔ بہرحال تمام مسیحی علاقے صلاح الدّین کے زیر تصرّف آ گئے، البتہ صُور (Tyre) طرابلس اور انطاکیہ اُس کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔

صلاح الدّین کے عساکر میں بے قاعدہ فوج کے چند دستوں کے سوا اب پُرانی فاطمی فوج باقی نہیں تھی بلکہ اس کی فوج اب کُردوں اَور ترکوں پر مشتمل تھی اور مصری آبادی سے کلیتہً بیگانہ تھی۔ یہ فوج صلاح الدّین کو نورالدّین سے ورثے میں ملی تھی اور اس نے اسے مصری وسائل کی مدد سے اَور بڑھا لیا تھا۔ ۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء میں مصری فوج میں ایک سو گیارہ امیر تھے، ۶۹۷۶ طَواشی (=پورے ساز و سامان سے آراستہ رسالے کے سپاہی) اور ۱۱۵۳ قرہ غلام (=دوسرے درجے کے سوار)۔ علاوہ عرب سرحدیوں کے، جو غیر ملکی مہمات میں حصہ لینے کے لیے موزوں نہ تھے (H. A. R. Gibb: *The Armies of Saladin* *Cahiers d'Histoire Égyptienne*، ۳/۴ (۱۹۵۱ء): ۳۰۴-۳۲۰)۔ اس فوج میں شام اور الجزیرہ کے دستوں کا بھی اضافہ کر لیجیے، جن میں موصل کے وہ دستے بھی شامل تھے جنھیں ۱۱۷۴-۱۱۸۳ء کی مخاصمتوں کے بعد کے صلح نامے کی رو سے صلاح الدّین بوقت ضرورت طلب کر سکتا تھا۔ ان فوجیوں کی کل تعداد چھے ہزار سے کچھ اوپر تھی۔ صلاح الدین نے اپنی پوری فوج کے ساتھ، جو تقریباً بارہ ہزار سواروں پر مشتمل تھی، حطّین کو فتح کیا اور دوسری کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن اس قسم کے دستوں پر مشتمل لشکر ضروریات کی دقت کی بنا پر طویل عرصے کے لیے کسی ایک مہم پر متعیّن نہیں کیے جا سکتے تھے (قب سطورِ ذیل)۔ اس تمام زمانے میں، جب کہ تیسری صلیبی جنگ جاری رہی، فوج کی قوت کو مؤثّر طور پر قائم رکھنا ناگزیز تھا، چنانچہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے کس قدر سعیِ پیہم اور یقینِ محکم کی ضرورت تھی اور جیسا کہ مُرْضی (مَرْضی) بن علی کے رسالے [''بندوق سازی''] سے، جو ہمارے سامنے موجود ہے (طبع Cl. Cahen، در *B. Ét. or.*، ۱۹۴۸ء، ۱۲: ۱۰۸-۱۶۳)، پتا چلتا ہے لشکر کشی اور محاصرے کے ساز و سامان پر بھی، جس میں غالباً تعداد اور نوعیت دونوں کے اعتبار سے اضافہ ہو چکا تھا، توجّہ ضروری تھی۔

اپنے دَورِ حکومت کے ابتدائی برسوں میں صلاح الدین کو بوزنطیوں، نارمنوں اور اطالویوں کے بحری بیڑوں کے خطرے کا سامنا کرنا پڑا، جو لاطینی بلادِ شرقیہ کو اپنے مستقر کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ اس نے بحیرۂ روم میں فاطمیوں کے بحری بیڑے کو از سرِ نو منظّم کرنے کی انتہائی کوشش کی، جس کی حالت چھٹی/بارھویں صدی کی داخلی شورشوں نیز صلیبی محاربین اور اطالویوں کی کامیابیوں کے باعث

بے حد ابتر ہو چکی تھی۔ اس طرح وہ نزدیک ترین فرنگی بندرگاہوں پر جارحانہ حملوں کا سلسلہ شروع کرنے کے قابل ہو گیا۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ بھی ہو کہ قرہ قوش نے اپنی سلطنت کی حدود افریقی سواحل تک وسیع کر لی تھیں، جس سے ایک طرف تو شورش پسند ترکمانوں کو اپنی ترکتازیوں کے لیے ایک میدان ہاتھ آ گیا اور دوسری طرف یہ مقصد بھی حل ہو گیا کہ ساحل کے ساتھ ساتھ اسلامی جہاز صف بندی کر سکیں اور اُن علاقوں تک آسانی سے رسائی ہو سکے جہاں سے ان جہازوں کے لیے لکڑی اور ملّاح حاصل کیے جا سکتے تھے۔ صلیبی جنگ نے اس کوشش کا خاتمہ کر دیا، کیونکہ لکڑی اور ملّاح حاصل کرنے کے سلسلے میں مصر مقابلۃً کم زور رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صلاح الدین کے جانشینوں نے اس تجربے کا اعادہ نہیں کیا A. S. Ehrenkreutz: *The place of Saladin in the naval history* etc.، در *JAOS*، ۷۵/۲ (۱۹۵۵ء): ۱۰۰-۱۱۶.

اس میں شک نہیں کہ محض تجارتی مفاد کی خاطر نہیں بلکہ ایک حد تک اس خام مواد کی ضروریات کو پُورا کرنے کے لیے جو برّی اور بحری افواج کے اسلحہ کے لیے درکار تھا صلاح الدّین کو برسر اقتدار آنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد ان تعلقات کو دوبارہ قائم کرنے اور بڑھانے کا خیال آیا جو فاطمی عہد میں پیزا (Pisa) اور دوسرے اطالوی شہروں سے قائم تھے اور جو اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ فرنگیوں کو مصر پر حملہ آور ہونے کی بھی ہمّت ہو گئی تھی۔ اب پیزا، جنوآ اور وینس کے سوداگر بڑی تعداد میں اسکندریہ میں جمع ہونے لگے، کیونکہ ۱۱۷۱ء سے ۱۱۸۴ء تک بوزنطیوں نے قسطنطینیہ میں وینس کے سوداگروں کے لیے تجارت کرنا ناممکن بنا دیا تھا۔ اب اُنھوں نے محسوس کیا کہ اس نقصان کی تلافی عکّہ کی بہ نسبت اسکندریہ میں کہیں بہتر طریق سے ہو سکتی ہے Cl. Cahen: *Orient Latin et commerce du Levant*، در *Bull. de la Fac. des Lettres de Strāsb-ourg*، ۲۹/۸ (۱۹۵۱ء): ص ۳۳۲). یہی وجہ ہے کہ ان مکتوبات میں جو صلاح الدّین نے خلیفۂ بغداد کے نام ارسال کیے وہ فخر سے لکھ سکتا تھا کہ خود فرنگی اسے وہ اسلحہ بہم پہنچا رہے ہیں، جو آگے چل کر دوسرے فرنگیوں کے خلاف استعمال ہوں گے (اَبُوشامہ، ۱: ۲۴۳).

[سلطان] صلاح الدّین نے بوزنطی سلطنت اور قبرص کی سیاسی صورت حالات سے بھی فائدہ اُٹھایا اور ایک دوسرے کی بے خبری میں ان سے فرنگیوں (Franks) کے خلاف معاہدے کے لیے گفت وشنید شروع کر دی۔ جب اس نے یورپی حملے کا خطرہ منڈلاتے دیکھا تو پہلے تو قرہ قوش کے ذریعے وہ نارمنوں اور الموحّدون کے مقابلے میں جزائر بَلیارِک (Balearic) کے بنوغانیہ کا حلیف بنا، جو المرابطون میں سے تھے، پھر الموحّدون سے بحری نوعیت کا ایک معاہدہ کرنے کی کوشش کی، تاکہ صلیبی محاربین کا مقابلہ کیا جا سکے، تاہم اس کوشش میں اسے کوئی کام یابی حاصل نہیں ہوئی (قب Gaudefroy Demombynes، در *Mélanges René Basset* II وسعد زغلُول عبدالحمید، در *Bull. Fac. Arts Univ. Alexandria*، ج ۶ و ۷، ۱۹۵۲-۱۹۵۳ء: ص ۲۴-۱۰۰). ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں سے اس کی گفت وشنید کی تشریح بھی انھیں اسباب سے کی جا سکتی ہے.

جنگ کی پالیسی قدرۃً مہنگی تھی۔ اس نے وہ تمام ٹیکس بھی منسوخ کر دیے جو فقہا نے [اسلام کی رو سے] ناجائز قرار دیے تھے اور یہ بات اس دینی نصب العین کے مطابق تھی جو اکثر اس کے مدّنظر رہتا تھا۔ اسی طرح عہدِ فاطمیہ کے تمام آثار مٹا دینے کی خواہش کے زیر اثر اس نے پرانے سکّوں کے بجائے نئے سکّے جاری کیے۔ ان نئے سکّوں کے وزن، جن میں طلائی دینار اور درہم دونوں شامل تھے، مختلف اوقات میں بدلتے رہتے تھے، جس کے باعث ان کی کوئی معیّنہ قیمت باقی نہ رہی تھی۔ مصارف کا بوجھ، آمد کی کمی، جو شورشوں کا لازمی نتیجہ تھی، اس کے علاوہ مصری سونے کے ذخائر کا ختم ہونا اور سوڈانی سونا حاصل کرنے کے سلسلے میں راستوں کی دشواری، جو الموحّدون کے تصرّف میں تھے، ان تمام باتوں نے دینار کے معیار میں بھی عدم استحکام پیدا کر دیا اور مصر کے قانونی درہم کے علاوہ (جس میں تیس فی صد چاندی ہوتی تھی، جو قیمت میں دینار کے چالیسویں حصّے کے برابر تھی) اور قسم کے درہموں کے ضرب کرنے کا، جن میں دوسری دھاتوں کی آمیزش ہوتی تھی، قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ رائج الوقت سکّوں میں استحکام نہ رہ سکا۔ صلاح الدّین اور اس کے بعد العزیز ہمیشہ تاجروں اور امیروں سے حاصل کیے ہوئے قرضوں پر گزارہ کرتے رہے۔ قیاس یہ تھا کہ آگے چل کر جنگ سے جو مالی فائدے حاصل ہوں گے ان سے یہ ادائگی ہو جائے گی اور ایک بار پھر مالی استحکام کی صورت نکل آئے گی (قب (۱) A. S. Ehrenkreutz: *Contribution to the knowledge of the fiscal administration of Egypt*، در *BSOAS*، ۱۵/۳، ۱۹۵۳ء و ۱۶/۳، ۱۹۵۴ء؛ (۲) *The standard of fineness of gold coins in Egypt....*، در *JAOS*، ۷۴/۳، ۱۹۵۴ء؛ (۳) *The crisis of the dinar in the Egypt of Saladin*، وہی مجلّہ، ۷۴/۳، ۱۹۵۶ء.

جنگ میں صلاح الدّین کو شکست کبھی نہیں ہوئی، لیکن اس کے لیے اسے بے پناہ ہمّت اور کوشش سے کام لینا پڑا [صلیبی شکست کھا چکے تھے۔ شیر دل رچرڈ کا دل بیٹھ چکا تھا۔ اس نے سلطان کو پیغام بھیجا کہ میں آپ سے محبت اور دوستی پیدا کرنا چاہتا ہوں؛ میرا مقصد شام پر قبضہ کرنا نہیں؛ سلطان کی طرح مجھے بھی امن محبوب ہے۔ آخر ۲۲ شعبان ۵۸۸ھ/ ۳ ستمبر ۱۱۹۲ء کو صلح نامۂ عکّہ تیار ہوا۔ جب معاہدہ رچرڈ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ آخر یکم شوال/ ۱۰ اکتوبر کو وہ یورپ واپس چلا گیا۔ اس کے بعد ۲۷ صفر ۵۸۹ھ/ ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو سلطان کا انتقال ہو گیا۔ عماد نے اس کی وفات پر لکھا: ''مات بموته رجال الرجال''۔ اس نے اپنی سلطنت میں کردستان سے تونس تک ان اقوام کو جمع کیا جو حد درجہ بکھری ہوئی اور جن کی عادات مختلف تھیں۔ رعایا کے ساتھ اس کا سلوک عام بادشاہوں سے مختلف تھا۔ رعایا کا ہر فرد اس کے پاس پہنچ سکتا تھا، لباس،

خوراک اور مکان کے لحاظ سے وہ سادگی کی تصویر تھا۔ وہ مال اور مٹی کو برابر سمجھتا تھا۔..... Historians History میں ہے: جس چیز نے مسیحیوں کو حیرت میں ڈالا وہ صلاح الدّین کی مروّت، سخاوت، کرم، رحم، حلم، درگذر اور عفو ہے، خصوصًا معاہدات کی پابندی۔ یہ اس شخص کے اوصاف ہیں جس نے انھیں شکست دی اور ان پر غالب آیا (تحت عنوان Saladin)۔ صلاح الدّین کی زندگی کا بیشتر حصّہ لڑائیوں میں گزرا لیکن اس نے تمدن اور رفاہ عامّہ کے بھی بہت سے کام سرانجام دیے۔ صلاح الدّین نے مصر پر چوبیس سال اور شام پر اُنیس سال حکومت کی۔ وفات پر اس کا بڑا بیٹا الملک الافضل (پیدائش ۵۶۵ھ) جانشین ہوا].

(۲) صلاح الدّین کے بھائی الملک العادل اور بھتیجے الملک الکامل (م ۶۳۵ھ/ ۱۲۳۸ء) کا عہد بنیادی طور پر امن و امان کا دَور ہے، جس میں ان شورشوں کو فرو کرنے کے بعد جو صلاح الدّین کی وفات کے بعد پیدا ہوئیں سلطنت کا نظام درست کرنے کی کوشش کی گئی۔ بانیِ خاندان کی وفات کے بعد آٹھ برس کا عرصہ دراصل اتّحاد خاندان کے اس تصوّر کی آزمائش کا دَور تھا جسے اس نے اپنی بادشاہت اور جانشینی کے سلسلے میں ہمیشہ پیشِ نظر رکھا تھا۔ اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے افرادِ خاندان کو جاگیروں یا موروثی ترکے کے حصّوں کی صورت میں بہت سے علاقے عطا کر دیے تھے؛ یمن اس کے علاوہ تھا، جہاں یکے بعد دیگرے اس کے دو بھائی سریر آرائے حکومت ہوئے۔ اسی طرح اس نے وسطی اور جنوبی شام اپنے بیٹے الافضل کو، مصر اپنے دوسرے بیٹے [العزیز، پیدائش ۵۶۷ھ] کو، حلب اپنے تیسرے بیٹے الظاہر غازی کو، حماۃ اپنے بھتیجے تقی الدین عمر کو، حمص اپنے ابن عم یعنی شیرکوہ کے پوتے المجاہد کو اور الجزیرہ اپنے بھائی الملک العادل ابوبکر کے سپرد کیا تھا۔ العادل، جس نے ایک مدبّر اور منتظم کی حیثیت سے صلاح الدین کے عہد حکومت میں بڑا اہم کام کیا تھا، اب اس خاندان کا بزرگ ترین فرد اور باقی ماندہ اشخاص میں سب سے زیادہ ممتاز تھا۔ صلاح الدین کے بیٹے اہل نہ تھے۔ وہ یا تو تفریح میں مشغول رہتے تھے یا آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، چنانچہ کئی موقعوں پر انھوں نے العادل سے حمایت یا ثالثی کی درخواست کی۔ یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ سلطنت ایوّبی کا قیام اور تحفّظ اس کے برسر اقتدار آنے ہی پر منحصر ہے۔ ۵۹۷ھ/ ۱۲۰۰ء میں اس نے قاہرہ میں اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا اور دمشق اور الجزیرہ کی حکومتیں اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیں اور جب ۱۲۰۱ء میں آخری لڑائیاں ہو چکیں تو اس نے گزشتہ حکمرانوں سے صرف حَلَب، حمص اور حَماۃ کے فرماں رواؤں کو ان کی جگہ پر متمکّن رہنے دیا، جنھوں نے اس کے سامنے مجبورًا سر اطاعت خم کر دیا تھا۔ العادل کی وفات کے بعد اسی قسم کے مسائل قدرتی طور پر پھر ابھر آئے۔ اس زمانے (۶۱۵ھ/ ۱۲۱۷ء) میں کچھ عرصے کے لیے دِمیاط (Damietta) میں صلیبی جنگ کے باعث اس کے بیٹے الکامل کی ذات استحکام کا مرکز بنی رہی، جو العادل کی مانند مصر کا فرماں روا ہونے کے علاوہ ایک مرعوب کُن شخصیت کا مالک بھی تھا؛ لیکن جب ایک بار فرنگیوں کا خطرہ دُور ہو گیا تو وہ عہد نامہ جو اُس کے اور اُس کے بھائی المعظّم فرماں روائے دمشق (م ۶۲۵ھ/ ۱۲۲۸ء) اور پھر اس کے بیٹے اور جانشین الناصر داؤد کے درمیان ہوا تھا پارہ پارہ ہو گیا۔ الکامل کو اپنے دوسرے بھائی الاشرف کی وفاداری کے باعث بڑی تقویت حاصل ہوئی، چنانچہ اُس نے اسے دیار مُضَر کے عوض دمشق کی حکومت دے دی اور داؤد کو معزول کر کے کَرَک میں منتقل کر دیا۔ اس کے بعد چند سال تک الکامل بلا نزاع و اختلاف خاندان کا سردار تسلیم کیا جاتا رہا۔ الاشرف کی وفات (۶۳۵ھ/ ۱۲۳۷ء) کے وقت کچھ عرصے سے الکامل اور الاشرف کے تعلّقات میں گرم جوشی روز بروز ختم ہوتی جا رہی تھی، چنانچہ اس کے بعد الکامل نے اپنے ایک اَور بھائی الصالح اسمٰعیل سے دمشق واپس لے لیا، جسے الاشرف نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا، لیکن اگلے ہی سال کے اوائل میں خود الکامل بھی وفات پا گیا۔ وہ آخری ایوّبی فرماں روا تھا جس میں پورے خاندان کو اپنے تحت متحد رکھنے کی صلاحیت موجود تھی.

ہمیں [مذکورۂ بالا] اختلافات سے غلط نتائج اخذ نہیں کرنے چاہییں۔ اس وقت تک افرادِ خاندان کی اکثریت ہمیشہ ایسے اشخاص پر مشتمل رہی تھی جو اپنے ذاتی اغراض اور مفاد سے بلند ہو کر مشترکہ دشمن کے مقابلے میں متفق و متحّد ہو جاتے تھے؛ چنانچہ کسی نہ کسی طرح یہ استحکام تقریبًا نصف صدی تک بحال رہا، لیکن الکامل کی وفات کے بعد صورت حال بدل گئی.

ہمسایہ حکمرانوں کے ساتھ رقابتیں ایوّبیوں کے باہمی مناقشات میں دخل انداز ہوئیں۔ ۶۰۴ھ/ ۱۲۰۷ء میں جب اخلاط میں شورش ہوئی تو العادل کے بیٹے الاَوحد کو، جو اس وقت دیار بکر کا والی تھا، یہ موقع مل گیا کہ شاہِ اَرزن کے ترکے کو سلطنتِ ایوّبی میں شامل کر لے، اسی قسم کے جو دوسرے الحاقات ہوئے ان میں دیار بکر، دیار ربیعہ اور آخر میں آمِد اور حِصْن کَیفا (۶۳۱ھ/ ۱۲۳۳ء) کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ قدیم اُرتقی خاندان کی صرف ایک شاخ ماردِین میں باقی رہ گئی اور اس طرح ایوّبی خاندان کے فرماں روا جب ان جنگوں سے فارغ ہوئے تو ان کی عظمت و شان میں مزید اضافہ ہو چکا تھا.

تقریبًا ۱۲۲۵ء سے الجزیرہ (میسوپوٹیمیا) اور ایران کی سیاسیات پر جلال الدّین منگوبرتی کی آمد سے بہت گہرا اثر پڑا۔ یہ حکمران مغول کے حملے کی تاب نہ لا کر اپنی خوارزمی فوجوں کے ساتھ بھاگ آیا تھا اور اب ایران اور اس کے سرحدی علاقوں میں ترکتازی کر رہا تھا۔ المعظّم اور الجزیرہ کے وہ لوگ جو الاشرف اور الکامل کے دشمن تھے اس کے ساتھ مل گئے، چنانچہ بالآخر وہ اَخلاط پر قابض ہو گیا اور اس شہر کو تاخت و تاراج کیا گیا ([۶۲۶ھ/] ۱۲۲۹ء)۔ اب خوارزم شاہ نے ایشیائے کوچک کا رخ کیا، جہاں الاشرف نے سلجوقی سلطان کو کمک پہنچا دی اور اس مرتبہ اَرزِنجان کے قریب حملہ آور کی تمام قوّت کچل ڈالی گئی.

سلجوقیوں اور ایوّبیوں کے باہمی اختلافات کے کچھ دیرینہ اسباب بھی تھے۔ ان دونوں خاندانوں کے مفاد صلاح الدّین کے زمانے ہی میں ایک دوسرے سے دیار بکر میں ٹکرا چکے تھے۔ پھر جب تیرھویں صدی میں خاندان سلجوقیہ کی قوت

میں ترقی ہوئی تو باہمی تصادم ناگریز نظر آنے لگا۔ اب سلجوقی اپنے پہاڑوں سے اتر کر عرب کے میدانوں پر شمالی شام سے لے کر دیار بکر تک چھا جانے کے لیے تیار تھے۔ حالات کے مطابق انھوں نے اپنا یہ مقصد اس طرح حاصل کیا کہ کبھی تو خود ایوبیوں کے علاقوں پر حملے کیے اور کبھی حلب کے ایوبی حکمرانوں کے سرپرست بننے کا اظہار کر کے انھیں ان کے ان عزیزوں کے خلاف لا کھڑا کیا جو مصر پر فرماں روائی کر رہے تھے۔ الاشرف کیقباد کی مدد کے لیے جو مہم لے کر گیا تھا اس سے الکامل کو یہ خیال گزرا کہ سلجوقی سلطنت کے مشرقی حصّے کی فتح ایک آسان کام ہوگا؛ چنانچہ [۶۳۰ھ/ ۱۲۳۳ء میں تمام ایوبی طاقتوں نے متحّد ہو کر حملہ کیا، لیکن ملک کے حالات سے لاعلمی اور اس مہم میں بعض حصّہ لینے والوں کے اندر جوش و ولولہ کے فقدان کے باعث انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ بعد ازاں سلجوقی افواج نے الکامل کے جانشینوں سے آمد واپس لے لیا (۶۳۸-۶۳۹ھ/ ۱۲۴۱ء)۔ اَخلاط کے کھنڈر تو وہ پہلے ہی الاشرف کے سپہ سالاروں سے چھین چکے تھے۔

آخر میں ایوبیوں کے حریف عیسائی تھے، یعنی گرجستانی، جن کے ساتھ اسی اَخلاط کے گرد و نواح میں جنگ کرنا ناگریز ہو گیا تھا۔ پھر خود فرنگی تھے۔ جہاں تک فرنگیوں کا تعلّق ہے، ایوبیوں نے تیسری صلیبی جنگ سے جو سبق حاصل کیا تھا وہ صلاح الدّین کی حکمت عملی کے بالکل برعکس تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ امن برقرار رہے اور ہر قسم کے لڑائی جھگڑے سے احتراز کیا جائے، لہٰذا وہ کوئی ایسی بات پیدا ہونے نہیں دینا چاہتے تھے جو مزید صلیبی جنگوں کا بہانہ بن سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے بعد اَور بھی صلیبی جنگیں ہوئیں، لیکن پیش قدمی بلادِ مشرق کے فرنگیوں کی طرف سے نہیں بلکہ یورپی سلطنتوں کی طرف سے ہوئی۔ قدرتی طور پر ایوبیوں نے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے حسبِ استطاعت ہر قسم کی پیش بندی کر لی تھی اور فوجی غفلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بوزنطیم (بوزنطیہ) کے سقوط اور الموحّدون کے زوال سے وہ حلیف ہاتھ سے جاتے رہے جن سے امداد کی توقّع کی جا سکتی تھی اور جنھیں حاصل کرنے کی صلاح الدّین نے بڑی کوشش کی تھی۔ علاوہ ازیں جب ایک بڑے (لیکن غیر محفوظ) بحری بیڑے کے رکھنے کی تجویز ترک کر دی گئی تو وہ برّی فوج کے ذریعے مصر کی حفاظت کرتے رہے، جو فوجی استحکامات کی تعمیر، ساحلی تعمیرات مثلاً تنّیس کی تخریب اور جاسوسوں کے ذریعے ہوئی تھی، تاہم جہاں تک صلیبی محاربین کا تعلّق ہے العادل اور الکامل نے بھی حتی الامکان کوشش کی کہ جنگ کے گراں خطرات مول لینے کی بجائے سیاسی مصلحت اندیشی سے کام لیا جائے۔

۶۰۰-۶۰۱ھ/ ۱۲۰۴ء میں العادل نے وہ ساحلی مقامات فرنگیوں کو لوٹا دیے جو اس کے قبضے میں تھے۔ اس طرح فرنگی علاقوں کا تسلسل بحال ہو گیا اور ان کے بیچ میں صرف لاذقیہ کا شہر رہ گیا، جو حلب کی ریاست میں شامل تھا۔ پانچویں صلیبی جنگ کے دوران میں اس کے جانشین الکامل نے اپنے بھائیوں کو، جو ایشیا میں موجود تھے، مدد کے لیے طلب کیا؛ مگر اس نے صحیح معنوں میں کوئی لڑائی لڑنے سے احتراز کیا۔ یہ طرزِ عمل خاص طور پر فریڈرک ثانی کی صلیبی جنگ کے وقت اس طریقے سے آشکارا ہوا کہ اس سے رائے عامّہ متأثّر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ادھر المعظّم خوارزم شاہ سے جا ملا تھا۔ اس خطرے کی وجہ سے الکامل کے دل میں فرنگیوں سے صلح کی خواہش کچھ اَور بھی بڑھ گئی تھی۔ اسے ان حالات کا علم تھا جن کے باعث خود شہنشاہ صلح کی بات چیت پر مائل ہو گیا تھا اور انجام کار اس نے بیت المقدس کا شہر اس شرط پر اسے دے دیا کہ اسے فوجی اعتبار سے مستحکم نہیں کیا جائے گا اور عبادت کی آزادی برقرار رہے گی۔ [اس معاہدے سے] متدیّن مسلمانوں اور دین دار عیسائیوں کو یکساں طور پر صدمہ ہوا، لیکن اس سے دونوں بادشاہوں کے مابین ایسی دوستی کا آغاز ہو گیا جو ان کے جانشینوں کے درمیان بھی قائم رہی۔

ریاست حَلب کو ذرا مختلف قسم کے مقامی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں کے حکمران اس بات سے پریشان تھے کہ صلاح الدّین کی اپنی اولاد میں سے العادل کے خاندان کے مدِّ مقابل صرف وہی رہ گئے تھے؛ لہٰذا انھوں نے اوّل تو خاندانِ العادل میں ازدواجی تعلّقات کے ذریعے ان سے رشتۂ اتّحاد مستحکم کرنے کی کوشش کی اور دوسرے مصر کے ان طاقتور حاکموں کے خطرے سے بچنے کے لیے کبھی الجزیرہ، حمص اور حَماۃ کے ایوبیوں کا وسیلہ تلاش کیا اور کبھی رُوم کے سلجوقیوں کا؛ نیز قدرتی طور پر جب وہ ان فریقوں میں سے کسی کو حدود سے تجاوز کرتے دیکھتے تو اس کے خلاف دوسرے فریق سے مل جاتے تھے۔ اسی طرح Cilicia کی ارمنی بادشاہت کے بڑھتے ہوئے عزائم بھی ان کے لیے پریشان کن تھے؛ چنانچہ انھوں نے اس کے خلاف کئی بار سلجوقیوں کا ساتھ دیا، جو انطاکیہ کے نسبتاً کم زور فرنگی فرماں رواؤں کی اعانت کر رہے تھے۔

فرنگیوں سے اس صلح جویانہ رویے کا قدرتی نتیجہ، جو پیش نظر بھی تھا، یہ ہوا کہ اطالویوں (اور اب کسی قدر کم درجے تک جنوبی فرانس اور قطلونیہ (Catalonia) سے تجارتی تعلّقات از سرِ نو بحال بلکہ پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہو گئے، جیسا کہ وینس اور جنوآ کے محافظ خانوں (archives) کی نجی دستاویزات سے پتا چلتا ہے۔ تیسری صلیبی جنگ کے بعد ایک بار پھر معاہدوں پر دستخط ہونے سے بھی پہلے جنوآ، پیزا اور وینس کے جہاز دوبارہ اسکندریہ اور کسی قدر کم تعداد میں دمیاط جانے لگے تھے۔ العادل کے زمانے میں کئی ایک معاہدوں کے ذریعے ان کے حقوق کی توثیق کر دی گئی۔ محاصل درآمد (Customs) کی رقم میں تخفیف ہو گئی اور انتظامی اور عدالتی سہولتیں دے دی گئیں۔ اس کے علاوہ چونکہ ریاست حَلب کی حدود سمندر تک پہنچتی تھیں، اس لیے شام میں اطالوی تاجروں کی سرگرمیاں اب صرف ان بندرگاہوں تک محدود نہ رہیں جو فرنگیوں کے قبضے میں تھیں بلکہ وہ لاذقیہ میں بھی اپنا مال اتارنے لگے اور حلب اور دمشق کی منڈیوں میں بھی باقاعدہ آنے جانے لگے۔ پتا چلتا ہے کہ جنوآ (Genoa) کی اہم شخصیت ولیم سپنولا (William Spinola) کو العادل نے خاص طور سے نوازا تھا، چنانچہ العادل اپنی ذاتی جاگیروں کا دورہ کرتا تو سپنولا کو ہم سفری کا شرف بخشتا تھا (قب *Annals of Genoa*، جن سے Schaube نے

Handelsgeschichte der Mittelmeer-Romanen، ص۱۲۱ میں استفادہ کیا ہے۔ نیز ابن نَطِیف، جس کا حوالہ Amari: Biblioteca arabo- sicula، ۲ (ضمیمہ): ۳۵، نے دیا ہے اور جس سے Schaube ناواقف تھا)۔ بحر ہند کے ملکوں کی پیداوار کے علاوہ، جو مصر کے علاقے میں سے ہوکر باہر جاتی تھی، مصر یورپ کے ہاتھ اپنی مقامی پیداوار بھی فروخت کرتا تھا، جس میں پھٹکڑی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ قدرتی طور پر صلیبی جنگیں یا اچانک حملے کا خطرہ بحران پیدا کرنے کا موجب بنتا رہتا تھا، جیسا کہ [۶۱۲ھ/ ۱۲۱۵ء] میں ہوا، جب کہ تین ہزار تاجر، جو اسکندریہ میں جمع تھے، عارضی طور پر حراست میں لے لیے گئے؛ لیکن [دوستانہ] تعلّقات دمیاط کی صلیبی جنگ کے بعد پھر بحال ہوگئے (جیسا کہ دوسری باتوں کے علاوہ اس عربی دستاویز سے معلوم ہوتا ہے جس میں الکامل نے وینس والوں کو حفاظت کا یقین دلایا تھا اور جسے صُبْحِی لبیب نے شائع کیا ہے) اور مجموعی طور پر بغیر کسی رخنے کے اس صدی کے وسط تک قائم رہے.

اگرچہ بحیرۂ روم پر اطالوی چھائے ہوے تھے اور ان کے ساتھ تجارت میں مصر کا کِردار خالصۃً ضمنی نوعیت کا تھا، کیونکہ تمام کاروبار وہ خود کرتے اور مصر کو صرف محصول اور آڑھت سے کچھ نفع مل جاتا تھا، تاہم انھیں بحیرۂ قلزم تک رسائی حاصل نہ تھی اور بحر ہند کی تجارت کلیۃً بدستور اسلامی (یا ہندو) ریاستوں کے باشندوں کے ہاتھ میں تھی۔ ہم قطعی طور پر یہ بات نہیں بتا سکتے کہ مصر یا یمن یا مزید مشرق کی طرف کے باشندوں کا اس تجارت میں کتنا حصّہ تھا۔ جو تاجر کارِمی کے نام سے مشہور تھے اور جنھیں عدن اور مصر میں بحر ہند کے راستے آنے والی پیداوار اور خصوصًا گرم مسالے کی تجارت میں خصوصیت حاصل تھی، ان کی صحیح نوعیت ابھی تک پردۂ خفا میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فاطمیوں کے زمانے سے موجود تھے، لیکن درحقیقت وہ ایوبیوں کے عہدِ حکومت میں اپنے اس کردار میں ظاہر ہوے جو انھیں آئندہ صدی میں زیادہ بڑے پیمانے پر ادا کرنا تھا۔ (قب توضیحات از Goitein و Fischel، در Journal of the Economic and Social History of the Orient، ۱۹۵۸ء و G. Wiet: Les marchands d' Epices، در Cahiers d' Histoire Egyptienne، ۱۹۵۵ء)۔ یمن پر ایّوبیوں کے قبضے کی ابتدائی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس طرح سے وہ فاطمی سلطنت کی بحالی چاہنے والوں کو محصور کرنا چاہتے تھے یا یہ کہ یہ علاقہ آئندہ کسی وقت ایّوبیوں کے لیے پناہ گاہ کا کام دے سکے؛ لیکن بلاشُبہہ یہ مقصد بھی پیش نظر تھا کہ یمن اور مصر کے مابین تجارتی تعلقات بہتر ہو جائیں اور یہ چیز بہرصورت بروے کار بھی آئی۔ یہ بات دونوں فریقوں کے لیے مقدّم اہمیت رکھتی تھی، چنانچہ یمنی سکّے اور بعض اوزان مصر کے ساتھ ایک ہی معیار پر لائے گئے (ابن مُجَاوِر، طبع Löfgren، ص ۱۲ ببعد).

چونکہ مصر میں داخلی اعتبار سے قریب قریب مکمل امن قائم رہا اور اسی طرح شام کو بھی نسبۃً طویل پُرامن ادوار سے متمتّع ہونے کا موقع نصیب ہوا اس لیے ان ممالک کی اقتصادیات پر یقینًا خوش گوار اثر پڑا، اور اسے اُن تجارتی امکانات سے بھی تقویت پہنچی جنھیں ایّوبیوں نے قصدًا، خواہ اپنے مالی مفاد کی غرض ہی سے سہی، ترقی دینے کی کوشش کی۔ بہرحال اس اثر کی ٹھیک ٹھیک نشان دہی کرنا مشکل ہے۔ شام اور الجزیرہ کے ذرائع و وسائل کا کچھ اندازہ ابن شدّاد کی کتاب الاعلاق سے ہوسکتا ہے، جس نے مغول کے حملے کے قریب وہاں کی کیفیت بیان کی ہے۔ دمشق کی دست کاریوں کے بارے میں زیادہ تفصیل و تشریح کے ساتھ خاصی معلومات اس رسالے میں ملتی ہیں جو عبدالرحمٰن بن نصر الشَیْزَری نے ۶۰۰ھ/ ۱۲۰۰ء [کذا؟ ۱۲۰۳-۱۲۰۴ء] کے لگ بھگ "حِسْبَۃ" پر مرتب کیا تھا (طبع عَرِینی، قاہرہ ۱۹۴۶ء، مترجمۂ Bernhauer: Les institutions de police, etc.، در JA، ۱۸۶۰ء، جہاں مصنّف کا نام نَبْرَوی بتایا گیا ہے)۔ مصر اور شام میں اس قسم کے جو رسالے بعد میں لکھے گئے بظاہر ان کا نقش اوّل یہی رسالہ تھا۔ مصر کے متعلق المَقْرِیزِی کے ہاں جو معلومات محفوظ ہیں ان کے علاوہ بہت سے اشارے ابن المَمّاتی اور النابُلُسی کے رسائل میں ملتے ہیں (قب سطورِ ذیل)۔ مؤخّر الذکر خصوصًا جنگلات کی حفاظت، نظامِ آب پاشی اور سرکاری طور پر گنّے کی کاشت میں الکامل کی دلچسپی کی تصدیق کرتا ہے۔ عام طور پر مصر اور دوسری ایوبی ریاستوں کے مابین یوں امتیاز کیا جا سکتا ہے کہ مصر کو ہمیشہ کی طرح ایک ایسی اعلیٰ درجے کی مملکت ہونے کا شرف حاصل رہا جس کی اقتصادیات جزوی طور پر قومی بنا لی گئی تھیں، خاص طور پر جہاں تک کان کنی، جنگلات کی پیداوار، دھاتوں اور لکڑی کی تجارت، بعض ذرائع حمل و نقل، آلات اور اسلحہ وغیرہ کا تعلّق ہے۔ النابُلُسی کا لَمُع [القوانین] ایک کتابچہ ہے جو الکامل کی وفات سے پیدا ہونے والی ابتری کے بعد لکھا گیا تھا۔ اس میں اس نقصان کو خوب نمایاں کیا گیا ہے جو سرکاری ذمّے داریوں کے ذاتی ہاتھوں میں چلے جانے سے، نیز ان مجرمانہ فریب کاریوں سے پہنچا جو نگرانی کے اٹھتے ہی عہدے داروں کی طرف سے سرزد ہوئیں.

العادل اور الکامل کے عہد میں نہ صرف اقتصادی معاملات کی طرف توجہ کی گئی بلکہ ایک باضابطہ مالی حکمت عملی پر بھی عمل ہوتا رہا تھا۔ العادل کا مشہور وزیر ابن شکر جہاں اپنی اعلٰی کاردانی کے باعث بھی مشہور ہوا وہاں وہ اپنے اُس خود سرانہ رویے کے باعث بھی شہرت رکھتا تھا جو وہ اپنے بادشاہ سمیت ہر ایک کے ساتھ برتتا تھا۔ اس کے بعد بھی الکامل نے ویسی ہی مستعدی سے مصارف اور مداخل پر (جن میں امرا کے اقطاع بھی شامل تھے) محاسبہ قائم رکھا اور جب فوت ہوا تو تقریبًا ایک سال کے میزانیے کے مساوی خزانہ چھوڑا۔ النابُلُسی نے فیُّوم میں مصر کے بارے میں جو تحقیقات کی وہ اگرچہ صرف ۶۴۲ھ [۱۲۴۴-۱۲۴۵ء] سے متعلق تھی تاہم اس سے مال گزاری کے لیے مساحتِ اراضی اور حساب و کتاب میں نہایت باریک بینی کا پتا چلتا ہے (قب Cl. Cahen: Le régime des impots dans le Fayyūm ayyūbide، در Arabica، ۳/۱، ۱۹۵۶ء)۔ جہاں تک شمالی ریاستوں کا تعلّق ہے ابن شَدّاد نے ہمارے لیے حلَب، مَنْبِج، سَرُوج اور بالِس کے شہروں کے محاصل کی فہرستیں چھوڑی ہیں۔ مالی و

اقتصادی معاملات کے بارے میں جو احتیاط برتی گئی تھی اس سے یہ بھی ممکن ہو گیا کہ دوبارہ بڑے پیمانے پر صلاح الدّین سے پہلے کے رائج معیار کے مطابق دینار ڈھالے جائیں۔ اس کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تانبے کے سکّوں کے آگے چاندی کے سکّوں کے غائب ہوتے جانے کو روکنا مشکل ہو گیا تھا دیکھیے De L'évolution monetaire de l'Égypt mediévale:Bouard، در L' Égypte Contemporaine، ۱۹۳۹ء).

ایوّبی ریاستوں کے اندرونی معاملات کی تاریخ کا بہت کم مطالعہ کیا گیا ہے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ اس سے واقفیت حاصل کی جائے۔ بالخصوص جہاں تک مصر کا تعلّق ہے، کیونکہ اسی زمانے میں اس طرزِ حکومت کی بنیاد پڑی جسے مملوک سلاطین نے دوسو برس تک بڑی حد تک جاری رکھا اور جزئیات کے لحاظ سے مکمّل کیا۔ اس طرزِ حکومت میں نہ صرف ایک حد تک گزشتہ فاطمی روایات ترک کر کے ان کی جگہ زیادہ مشرقی سلجوقی اور زنگی روایتیں داخل کی گئیں بلکہ مصری میراث کو بھی کسی قدر باقی رکھا گیا، نیز کئی نئی باتیں اختیار کر لی گئیں اور قدیم باتوں کو ضرورتِ وقت کے مطابق ڈھال لیا گیا۔ مگر قدرتی طور پر یہاں صرف چند ایک ضمنی اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں.

الکامل کے عہد کے تقریباً آخری برسوں تک ایوّبی نظامِ حکومت کو ایک نیم جاگیردارانہ خاندانی وفاق کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ مثلاً بنو بُویہ کا یا اس سے کسی قدر کم درجے پر سلجوقیوں اور زنگیوں کا رہا تھا۔ بادشاہ کے ماتحت، متعدّد علاقے خاندانِ شاہی کے باج گزار شہزادوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے۔ یہ شہزادے ان پابندیوں کے سوا جو ان پر بنیادی طور پر فوجی معاملات میں بادشاہ کے اطاعت گزار ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتی تھیں ان علاقوں کے نظم و نسق میں بالکل مطلق العنان ہوتے تھے (قب مثلاً الکامل کی وہ سند جس کی رُو سے فرمانروائے حَماۃ کو حکومت عطا کی گئی تھی اور جو ابن ابی الدّم کے وقائع (کتب خانہ Oxford، Bodl. Marsh شمارہ ۶۰) کے آخری حصّے میں محفوظ ہے۔ ان بڑی بڑی باج گزار ریاستوں کے اندر چھوٹی جاگیریں ہوتی تھیں۔ یہ بھی اسی طرح دوسرے درجے کے شہزادوں یا چند ایک بڑے عہدے داروں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں، مگر ان کی اطاعت کا مرکز باج گزار رئیس کی ذات ہوتی تھی اور اسی لیے ان کی آزادی بھی قدرتی طور پر زیادہ محدود ہو جاتی تھی۔ اس سے بھی نیچے وہ علاقے آتے تھے جنھیں صحیح معنوں میں عسکری اقطاع یا فوجی جاگیریں کہا جاتا ہے اور جن کا بیان آگے چل کر آئے گا۔

الکامل کے عہد کے اواخر میں اس نظامِ حکومت میں چند تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ سلطان جب کبھی مصر میں ہوتا تو [شام و فلسطین میں] اس کی نمائندگی ایک نائب کیا کرتا تھا، جو کبھی تو شاہی خاندان کا کوئی فرد ہوتا تھا یا کوئی اَور شخص، لیکن روز افزوں خاندانی جھگڑوں کے باعث سلطان مجبور ہو گیا کہ ایشیائی صوبوں میں بھی شہزادوں کی جگہ والی مقرر کر دے، جو انھیں کے نجی ملازمین میں سے منتخب کیے جاتے تھے، جیسے دِیار بکر میں شمس الدّین صَوَاب، جو کسی نوعمر شہزادے کی موجودگی یا غیر موجودگی میں کام کرتے تھے۔ ان والیوں کے خطاب 'نائب' سے بھی ان کی ماتحتی کی ایسی وضاحت ہوتی تھی جو کسی اَور خطاب سے نہ ہو سکتی تھی۔ الکامل کے بعد جن حالات میں الصالح ایوّب نے ایوّبیوں کا اتّحاد دوبارہ قائم کیا مرکزیت کا یہ تصوّر ان کی بدولت بھی کامیاب ہوا۔ علاوہ ازیں مصر میں، چند ایک مستثنیٰ اور عارضی صورتوں سے قطع نظر (جیسے فیّوم میں) کبھی خود مختار باج گزار ریاستیں قائم نہیں ہوئیں۔ اس کے برعکس ایشیا میں تمام خود مختار شہزادوں نے فرمانروائے مصر کی طرح اب سلطان کا لقب اختیار کر لیا تھا، جو صلاح الدّین نے کبھی سرکاری طور پر استعمال نہیں کیا تھا، شاید اس لیے کہ فاطمیوں کے سابقہ دور میں اس لقب کا تعلّق وزیر سے ہوتا تھا؛ چنانچہ اس کے ماتحت دوسرے ایوّبیوں نے بھی مَلِک کا لقب ہی اختیار کر رکھا تھا.

مندرجۂ بالا امور کے پیشِ نظر ایوّبی ریاستوں کی تنظیم میں کبھی وحدت پیدا نہ ہو سکی؛ چنانچہ یمن سے قطع نظر عام طور پر انھیں ایک دوسرے سے یوں ممیّز کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف تو ایشیائی مملکتیں تھیں، جن میں بغیر کسی بڑی تبدیلی کے زنگی تاسیسات پر عمل درآمد ہوتا رہا، اور دوسری طرف مصر تھا، جہاں نسبتہً نئے یا کم از کم مصر کے لیے نئے آئین جاری کیے گئے۔ اس کا متوقّع نتیجہ یہ ہوا کہ ماضی کے مقابلے میں مصر کے مرکزی ادارے بہت کچھ بدل گئے، مگر اس کے مقابلے میں مقامی نظم و نسق کے بنیادی آئین و قوانین میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ابتدائی پریشانیوں کے دور ہوتے ہی خود صلاح الدّین کی زندگی میں معاملات کو سُلجھانے کی کوشش کی گئی، جیسا فاطمی تاسیسات کی اس کیفیت سے ظاہر ہوتا ہے جو نئے دورِ حکومت کے لیے ابن الطّوَیر نے لکھی تھی (اور جس کے اقتباسات المُقریزی اور ابن الفُرات کے ہاں ملتے ہیں)؛ نیز خراج پر قاضی ابو الحسن کے رسالے (جس کے اقتباسات المقریزی نے دیے ہیں) اور ابن الممّاتی کی مشہور کتاب قوانین الدَّوَاوین سے۔ یہ نگارشات دست بُردِ زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہیں۔ ان میں کچھ اَور کتابوں کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً دواوین (یا محکموں) کے بارے میں ابن شِیث القرشی کی کتاب، جس میں ادبی رنگ زیادہ پایا جاتا ہے اور جو قدرے بعد کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ ان باضابطہ بیانات کے مقابلے میں اور ان کے جوڑ کی حیثیت سے ایوّبیوں کے اواخر عہد میں عثمان بن ابراہیم النابُلُسی کے متعدّد رسائل ہمارے سامنے آتے ہیں، جن میں سے کچھ مکمّل شکل میں موجود ہیں اور کچھ صرف اقتباسات کے ذریعے محفوظ رہ گئے ہیں۔ یہ رسائل مصنّف کے ذاتی تجربات و مشاہدات کی روشن شہادت ہیں.

مرکزی حکومت کو خود بادشاہ کم و بیش مؤثّر طریقے سے اپنی صواب دید کے مطابق چلاتا تھا۔ زیادہ تر باج گزار حکمرانوں کا ایک وزیر یعنی ایسا عہدے دار ہوتا تھا جو بادشاہ کے نام پر پورے نظم و نسقِ ملکی کی وحدت برقرار رکھنے کا ضامن تھا، لیکن مصر میں وزارت کے عہدے کا دستور کم تھا۔ قاضی الفاضل کی قدر و منزلت صلاح الدّین کی نظر میں جو کچھ بھی رہی ہو، اسے سب باتوں کے باوجود وزیر کا لقب ہرگز حاصل نہ تھا اور نہ اس نے کبھی وزارت کے فرائض انجام دیے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ بادشاہ حکومت کے تمام فرائض خود سرانجام دیتا تھا، اور دوسرے یہ کہ سابق فاطمی دستور کے مطابق، جس کی رُو سے وزیر کو غیر مشروط اختیارات

حاصل ہوتے تھے، وہ مصر میں اوّلاً وزیر ہی کی حیثیت سے برسرِ اقتدار آیا تھا۔ العادل نے خاصے عرصے تک ابن شکر کو، جو زبردست شخصیت کا مالک تھا، اس لیے اپنا وزیر بنائے رکھا کہ وہ صلاح الدّین کی بحری فوج کے انتظام میں ایک شریکِ کار کی حیثیت سے اس کی قدر و قیمت پہچان چکا تھا۔ الکامل نے اُسے کچھ مدّت کے لیے واپس بلا لیا تھا، لیکن بالآخر چند اعلیٰ عہدے داروں کی مدد سے، جنھیں وہ ہمیشہ تو نہیں مگر کبھی کبھی نائب وزیر کا لقب عطا کر دیتا تھا، نظم و نسق کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ اس کے بعد الصالح ایّوب نے ''فرزندانِ شیخ'' میں سے ایک کو اپنا وزیر بنالیا، جن کا ذکر ہم آگے پھر کریں گے۔ نابالغ یا یتیم شہزادوں کا ایک اتابیگ [رک بآں] ہوا کرتا تھا۔ استاذ دار بھی، جسے فرماں روا کے امورِ خانہ داری کا ایک طرح سے منتظم یا داروغہ کہہ سکتے ہیں، سیاسی امور میں اہم حصّہ لیتا تھا [دیکھیے جمال الدّین محمود الاستاذ دار]۔

فرماں روا اَور وزیر سے نیچے مرکزی نظم و نسق دو اوین میں منقسم تھا، جن کے نام اور فرائض منصبی فاطمی دَور کے دواوین سے پوری طرح مطابق نہ تھے۔ درحقیقت اب تک حکومت فوج ہی کے لیے کام کرتی تھی اور اسی لیے دیوان الجُیوش کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ ان کا ایک شعبہ اِقطاع سے متعلّق تھا، اس اعتبار سے اسے ایک حد تک وہ اختیارات حاصل تھے جو دیوانِ مالیات کے تھے۔ مؤخّر الذکر دیوان پر محاصل، آمدنی، خرچ اور خزانے کے تمام معاملات موقوف تھے اور اس کا ایک شعبہ ''الدّار'' [یعنی محل شاہی] کے مالی امور کے لیے وقف ہوتا تھا۔ ابن الممّاتی کے رسالے میں دوسرے دواوین کو نظر انداز کر کے اس دیوان کا حال بڑی تفصیل سے دیا گیا ہے۔ تیسرا بڑا دیوان، جسے بعض اعتبار سے مذکورۂ بالا دیوانوں میں ممتاز کہا جا سکتا ہے، دیوان الانشا یعنی دفتر دستاویزات (Chancery) تھا۔ جس کے سپرد مراسلت اور اسناد کی تحریر کا کام تھا۔ اس دیوان کا مشہور ترین ناظم [قاضی] الفاضل تھا، جسے فاطمی حکومت کی ملازمت سے لیا گیا تھا (عماد الدّین الاصفہانی، جو انشا پردازی میں اس کی تقلید کرتا تھا، صلاح الدّین کا کاتب خاص تھا)۔ پھر آخر میں دیوان الجُیُوس تھا، جو اگرچہ ضمنی تھا لیکن اہمیت میں دوسروں سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس کا ذکر النابُلُسی نے کیا ہے۔ قدرتی طور پر اسے مندرجۂ بالا دیوانوں کے برعکس کامل خودمختاری حاصل تھی۔ ایّوبیوں نے سلجوقیوں کا طُغرا اختیار کر لیا تھا (Cl. Cahen، در BSOAS، ۱۴/۱: ۴۲)۔ ان دفاتر میں بکثرت دستاویزات ہوتی تھیں، جن پر کارروائی کے لیے متعدّد ملازم رکھے جاتے تھے، جو ایک دوسرے کے کام کی نگرانی کرتے تھے۔ ایّوبی نظام حکومت کا سب سے زیادہ جاذبِ توجّہ ادارہ شدّ، یعنی مُشِدّ کا دفتر تھا۔ ملک کے نظم و نسق میں مقامی باشندوں پر، جن میں اکثریت قبطیوں کی تھی، اعتماد کیا جاتا تھا، کیونکہ صرف انھیں کو رسوم و آداب کی ضروری تربیت حاصل تھی، لیکن یا تو اس لیے کہ محکمۂ دیوان پر لوگوں کو خاطر خواہ اعتماد نہ تھا یا اس لیے کہ اس محکمے کو خود اتنے اختیارات نہیں دیے گئے تھے کہ وہ طاقتور ہو کر بالخصوص فوجی حکّام کے مقابلے میں اپنے فیصلوں کو مؤثّر طریق سے نافذ کر سکے، ہر دیوان اور شاید بحیثیت مجموعی تمام دواوین یا محکموں کے ساتھ ایک مُشدّ یعنی ایسا امیر لگا دیا جاتا تھا جس کے سپرد عام دیوانی نظم و نسق کی نگرانی ہوتی تھی اور وہ اس فرض کو خود اپنے فوجی دستوں کی اعانت سے سرانجام دیتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ [اس زمانے میں بھی] فوج میں کم سے کم اتنے ہی دستے ہوتے تھے جتنے صلاح الدّین کے زمانے میں تھے اور بلاشُبہہ اس میں بوقتِ ضرورت اِقطاع کی نئی عارضی تقسیم کے ذریعے اضافہ کیا جا سکتا تھا۔ اگرچہ تنخواہ یا براہِ راست تقسیم کا سلسلہ قطعی طور پر ختم نہیں ہوا تھا، تاہم فوج یا کم از کم امیروں کے لیے آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اِقطاع تھا۔ ایّوبی اِقطاع کا تعلّق فاطمی اور سَلجوقی دونوں روایتوں سے تھا، لیکن بالخصوص مصر میں یہ طریق ان دونوں نمونوں سے پوری طرح مطابقت نہ رکھتا تھا۔ فاطمی اقطاع کے مقابلے میں یہ اقطاع مالی بار سے نسبتاً آزاد تھا، کیونکہ اس کے ساتھ آمدنی کا عُشر دینے کی شرط نہ تھی؛ لیکن زنگی اقطاع کے مقابلے میں، جہاں مالکانِ اقطاع کو اپنے اپنے علاقوں میں جاگیردارانہ حقوقِ خودمختاری حاصل ہوتے تھے ایّوبی اقطاع میں سرکاری حکّام کا کہیں زیادہ عمل دخل ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ مُقطَع اخراجات کی بعض شقّوں کا ذمّے دار ہوتا تھا، لیکن دراصل اُسے کوئی حقیقی انتظامی حقوق حاصل نہ تھے بلکہ اسے محض ایک مقررہ آمدنی تفویض کر دی جاتی تھی، جس کی نوعیت کا وہ فیصلہ بھی نہیں کر سکتا تھا اور یہ آمدنی کسی وقت بھی اس سے واپس لی جا سکتی تھی یا کہیں اَور منتقل کی جا سکتی تھی۔ اس آمدنی کا تعیّن ایک تخمینے کے مطابق کیا جاتا تھا، جسے عِبرَۃ کہتے تھے اور حساب کی ایک اکائی دینارِ جَیُشی سے محسوب ہوتی تھی، جس میں نقد رقمیں اور فصلوں کی جنسیں دونوں ایک معیّنہ مقدار میں شامل ہوتی تھیں۔ عام طور پر فصل کی کٹائی کے موقع پر غرض مند فریق ہی کو جا کر اس مالیے کے عائد کرنے کی نگرانی کرنا پڑتی تھی جس کا وہ حق دار ہو (یہی وجہ ہے کہ زیادہ عرصے تک میدان جنگ میں [اہلِ اقطاع کی] فوج رکھنے کے سلسلے میں دشواری پیش آتی تھی)۔ عام طور سے بڑے بڑے امرا کے اقطاع ایک دوسرے سے فاصلے پر جداگانہ قطعاتِ اراضی پر مشتمل ہوتے تھے اور مُقطَع یعنی جاگیردار کو اقطاع پر جو آدمی رکھنے پڑتے تھے یا جنھیں وہ رکھ سکتا تھا ان کی تعداد معیّن کر دی جاتی تھی (شام کے ایّوبی علاقوں میں بھی یہی دستور تھا)۔ اس سے یہ رواج ہو گیا کہ امیروں کو دس نفری کا امیر، سو نفری کا امیر وغیرہ کہا جانے لگا؛ یہ بات پہلے نہ تھی (قب Cl. Cahen: *L'évolution de l' iḳṭā'*، در *Annales E. S. C*، ۱۹۵۳ء)۔

اس فوج کی ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ جن دستوں پر مشتمل ہوتی ان میں وحدت کا فقدان تھا اور باہمی رقابت بھی موجود تھی۔ کُردوں اور ترکوں کے درمیان نسلی مخاصمت کے بعض آثار کا سراغ ملتا ہے، لیکن اس کی بڑی وجہ یہ نہیں قرار دی جا سکتی کہ کرد بظاہر آزاد تھے اور ترک کم از کم عہدۂ امارت پر ترقی پانے سے پہلے غلام۔ سب سے زیادہ مؤثّر علّت یہ تھی کہ ہر ایک فرماں روا چاہتا تھا کہ اپنے لیے الگ ایک فوج بنائے، جسے وہ ذاتی طور پر ترتیب دیتا تھا اور جس کے سپاہی اس کی حمایت میں سربکف رہتے تھے، تاہم کسی فرماں روا کے نہ رہنے پر ضروری نہ تھا کہ جو فوج یا فوجیں اس نے مرتّب کی تھیں وہ بھی غائب ہو جائیں، کیونکہ ان کے سپاہی

نئے فوجی دستوں کے خوف سے چوکنّے اور آپس میں متحد رہتے تھے؛ چنانچہ ایّوبی دعوے دارانِ تخت و تاج کے باہمی مناقشات میں اس رشک و رقابت کا بڑا حصّہ تھا جو اَسَدِیّہ (اسد الدّین شیر کوہ کی نسبت سے)، صلاحیّہ، عادلیّہ، کاملیّہ، اشرفیّہ وغیرہ مختلف [فرماں رواؤں کی تیار کردہ] فوجوں کے درمیان پائی جاتی تھی.

ایّوبیوں کی فوجی حکمت عملی کی تکمیل پُرشکوہ قلعوں کی تعمیر سے ہوئی۔ یہ قلعے شہروں میں بھی بنائے گئے (مثلاً حلب، قاہرہ وغیرہ) اور دیہات میں بھی اور انھیں بالخصوص صلیبی محاربین کے مقابلے میں تعمیر کیا گیا تھا.

اس سوال پر بھی بعض اوقات قیاس آرائی ہوتی رہی ہے کہ ایّوبیوں کے بعض خصائص کو کس حد تک ان کی کردیت سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے خیالات بالعموم بے دلیل تعصّبات اور غلط معلومات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایّوبیوں کے عہد میں کُردوں کے دوش بدوش ترکوں کی اور زنگیوں کے دَور میں ترکوں کے ساتھ کُردوں کی موجودگی کے درمیان کوئی ایسا بہت بڑا فرق نظر نہیں آتا اور اگر اپنے اپنے حالات کے تقاضوں اور ان نتائج کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ دونوں حکومتیں اپنے نظامِ حکومت اور ذہنیت دونوں کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ ملتی جلتی تھیں؛ تاہم یہ غالبًا ایک اتّفاقی امر نہیں تھا کہ ایّوبیوں نے اپنی سلطنت کی حدود دیار بکر اور اَخلاط تک یا دوسرے الفاظ میں اپنے آبائی وطن یا کم از کم کُردوں کے علاقے تک بڑھانے کی کوشش کی تاکہ اس طرح فوج میں کُردوں کی بھرتی کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ بہرکیف خود اس فرماں روا خاندان میں چند پشتوں کے اندر ترکی اور کُردی خون کی آمیزش ہوگئی اور آگے چل کر معلوم ہوگا کہ آخری دَور میں اس حکومت نے اپنی کُردی خصوصیت بالکل ترک کر دی تھی.

زنگیوں اور اپنے دوسرے معاصرین کی طرح ایّوبی بھی سُنّی تھے۔ وہ الحاد کے خلاف اسلام کے مسلّمہ عقائد کے فروغ میں کوشاں رہے۔ اس روش کا اظہار سب سے پہلے تو یوں ہوا کہ مصر نے ایک بار پھر خلفاے عباسیہ کی سیادت قبول کر لی اور اسے مزید استقلال اس وقت حاصل ہوا جب خلیفہ النّاصر نے خلافت کا وقار ایک حد تک دوبارہ بحال کر لیا اور ادھر مسلمانوں کا اس امر پر اجتماع ہوگیا کہ ایّوبیوں کے حقوقِ خود اختیاری کو کسی طرح کا ضعف پہنچائے بغیر خلافت کا احترام محض الفاظ تک محدود نہ رہے؛ چنانچہ مثال کے طور پر باہمی جھگڑے چُکانے کے لیے اکثر اوقات خلیفہ کے سفیروں (مثلاً ابن الجوزی) کو ثالثی کے مکمّل اختیارات دے دیے جاتے تھے۔ مزید براں سلاطینِ ایّوبی اپنے دَور کے دوسرے فرماں رواؤں کی طرح اس سلسلۂ فُتوۃ [رَکّ بآں] میں شریک ہوگئے جس کے ذریعے النّاصر نے ایک طرف تو بغداد کے نچلے طبقے کو اپنے ہاتھ میں لینے کی اور دوسری طرف اپنے نظم و نسق کو مستحکم کرنے اور امرا پر ایک بار پھر اپنی سیادت اور اثر قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ خلیفہ کو امید تھی کہ اس سلسلے میں دوسرے فرماں رواؤں کو ملا لینے سے وہ نہ صرف انھیں اپنے ساتھ وابستہ کر لے گا بلکہ وہ خود بھی اپنی رعایا میں اسی قسم کا طرزِ عمل اختیار کر سکیں گے (اس مسئلے کی مزید تحقیق کے لیے قب Fr. Taeschner: *Die Futurowa* etc.، در *Schweizerisches Archiv für Volkskunde*، ج ۵۳، ۱۹۵۶ء).

ایّوبیوں کے عقائد راسخہ کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ سلجوقیوں اور زنگیوں کے بعد اُنھوں نے اور اُن کے اعلیٰ پائے کے امرا نے مدارس کی تعداد بڑھانے کی عملی طور پر ہمت افزائی کی؛ چنانچہ شام اور الجزیرہ میں اُن کی تعداد میں اضافہ کیا اور مصر میں پہلی بار انھیں جاری کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ الصالح ایّوب نے ایک نئی قسم کے مدرسے کی بنا ڈالی، جس میں فقہ کے چاروں مذاہب کا درس ہوتا تھا اور جس کی عمارت میں بانیِ مدرسہ کا مقبرہ بھی بنا دیا جاتا تھا۔ دوسری طرف ایّوبیوں نے صوفیہ کے طریقوں اور سلسلوں کا بھی خیر مَقدم کیا۔ یہ سلسلے اپنی اصل کے اعتبار سے بالعموم بلادِ مشرق سے تعلّق رکھتے تھے۔ سلاطینِ ایّوبی نے ان کے لیے شیخ الشّیوخ کی نگرانی میں متعدّد خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ ایک اَور نمایاں واقعہ یہ ہے کہ سلجوقیوں اور زنگیوں کی طرح ایّوبیوں کے گرد و پیش بھی خاصی تعداد میں ایسے مہاجرین نظر آتے ہیں جو زمانۂ حال یا قدیم میں ایرانی النّسل تھے۔ یہ خاص طور پر علمی اور ادبی حلقوں میں پائے جاتے تھے اور ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ اس کے علاوہ ایّوبیوں کے ایک اَور رجحان کا بھی پتا چلتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ قاضی اور دوسرے مذہبی علما حکومت کے کاروبار میں زیادہ سے زیادہ شریک رہیں۔ ان کے عہد کا ایک خاندان خاص طور سے قابلِ ذکر ہے، جو اولاد الشّیخ [رَکّ بآں] کے نام سے مشہور اور نسلاً خراسانی تھا۔ عام طور پر کوئی خاندان یا تو جنگ و جدال کے میدان میں خصوصیت رکھتا تھا یا مذہب اور فقہ کے شعبے میں یا دیوانی حکّام کے طبقے میں، لیکن اس خاندان نے اس عام کلیّے کے خلاف تینوں میدانوں میں ناموری حاصل کی۔ اس سلسلے میں بالخصوص وزیر معین الدّین اور اُس کے بھائی امیر فخر الدّین کا نام لیا جا سکتا ہے، جس نے اپنی وفات سے کچھ ہی مدّت پہلے منصورہ کی جنگ میں نائب السلطنت کے فرائض بھی سرانجام دیے تھے.

بایں ہمہ اگر ہم ایّوبیوں کے طرزِ عمل کا مقابلہ سلجوقی خاندان کے عظیم فرماں رواؤں کے طور طریق سے کریں تو یقینًا اوّل الذّکر میں نسبۃً زیادہ لچک نظر آئے گی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا سبب تو اُن کا یہ عمومی مقصد تھا کہ اُس کشیدگی کی شدّت کم ہو جائے جس کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں اور دوسرا سبب وہ روش تھی جو اُنھوں نے فرنگیوں (Franks) کے معاملے میں اختیار کی، لیکن یہاں اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ شام کے ملاحدہ کو زنگیوں کے ہاتھوں خاصا ضعف پہنچ چکا تھا اور اب ایّوبیوں کو ان سے جنگ کرنے کی واقعی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ باقی رہے اسمٰعیلیہ تو مصر میں ان کے زوال پر کسی کو بھی افسوس نہ تھا۔ تاہم حلب میں الظّاہر غازی کے دورِ حکومت میں شہاب الدّین سُہرَوَردی کو قتل کیا گیا (۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء؛ اسی لیے عرف عام میں اسے 'المقتول' کہا جاتا ہے)، لیکن یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ ایک انتہائی مخصوص نوعیت کا انفرادی معاملہ تھا اور اس اقدام کا مطالبہ حلب کے متقشّف لوگوں کی طرف سے کیا گیا تھا۔ ترکوں کے مقابلے میں،

جو حنفی تھے، ایوبیوں میں سے بیشتر امام الشافعیؒ کے پیرو تھے۔ ایوبیوں کے تعلقات ان پُرجوش احناف سے اتنے گہرے نہیں تھے جتنے سلجوقیوں کے، جن کے مجاہدانہ دینی مقاصد میں وہ دل وجان سے شریک رہے؛ تاہم المعظّم اور اس کا بیٹا داؤد حنفی تھے اور اس حقیقت سے شاید الکامل کے ساتھ ان کے مناقشوں کا سبب کسی حد تک سمجھ میں آجاتا ہے؛ چنانچہ مثال کے طور پر جب فریڈرک دوم سے معاملات طے ہونے لگے تو انھوں نے بلاشُبہہ مذہبی اعتبار سے انتہا پسند فریق کی نمائندگی کی.

اسی طرح عام طور پر مسیحیوں اور یہودیوں کو ایوبی خاندان کے خلاف شکایت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی اور جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے جب کوئی استثنائی واقعہ پیش آتا تو اس کا محرک سیاسی ہوتا تھا نہ کہ مذہبی۔ اس میں شک نہیں کہ ایوبیوں کا قبضہ ہوجانے پر اَرمنوں کے لیے فضا اس درجہ غیر معمولی طور پر سازگار نہ رہی جیسی آخری فاطمیوں کے عہدِ حکومت میں ہوگئی تھی [رک بہ اَرمینیہ] لیکن ان کے حقوق ومراعات کی ضبطی سے مسلمان نہیں بلکہ قبطی متمتّع ہوے۔ اسی طرح جب صلاح الدّین نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو اس نے وہاں کے مقامی مسیحی فرقوں میں سے ایسے لوگوں کو نوازا جن پر فرنگیوں سے ساز باز کرنے کا شُبہہ نہیں کیا جاسکتا تھا (قب من جملہ اَور چیزوں کے Cl. Cahen: *Indigènes et Croisés, un médecin d, Amaury et de Saladin*، در *Syria*، ۱۹۳۴ء و E. Cerulli: *Etiopi in Palestina*، ج ۱، ۱۹۴۳ء)۔ مصر میں ایوبی دَور قبطی کلیسا کی قوت کا دَور تھا، اگر کبھی کسی خفیہ سازش (مثلاً فرقہ ملکیّہ (Melkites) اور لاطینیوں کے درمیان) کے اندیشہ سے کشیدگی پیدا ہوئی تو اس کا اصل سبب صلیبی جنگوں کا ردِّعمل ہوا کرتا تھا؛ ورنہ عام حالات میں مقامی باشندوں اور لاطینی مسیحیوں کو آپس میں میل جول رکھنے کی ممانعت کرنا ضروری نہ سمجھا جاتا تھا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ ایوبی سلاطین نے ڈومینیکن (Dominican) اور فرانسسکن (Franciscan) مبلّغوں کو اپنی قلمرو میں داخل ہونے کی اجازت دے دی تھی.... یہودیوں کے ساتھ بھی خاصا اچھا برتاؤ کیا جاتا تھا، حتّٰی کہ جب بیت المقدس پر دوبارہ قبضہ ہوا تو انھیں واپس آنے کی دعوت دی گئی۔ اسی طرح ہسپانیہ کے نکالے ہوے یہود، مثلاً خاندانِ ابن میمون کا خیر مقدم کیا گیا، قب E. Ashtor Strauss: *Saladin and the Jews*، در *Hebrew Union College Annual*، ۱۹۵۶ء، ص ۳۰۵-۳۲۶).

ایوبی مملکت میں ثقافتی سرگرمیوں کا ایک سبب وہاں کی عام فضا کو بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک عربی زبان کا تعلّق ہے تیرھویں صدی عیسوی میں شام صحیح معنوں میں مسلم ثقافت کا مرکز تھا، اس کے تھوڑے عرصے بعد مصر بھی اس میدان میں اُترنے والا تھا لیکن ابھی وہاں کے پرانے عناصر اور ایوبیوں کے پسندیدہ نئے عناصر کے مابین صحیح امتزاج پیدا نہ ہوسکا تھا.... درحقیقت اس چمن کو ان سلاطین کی بدولت بڑی شادابی نصیب ہوئی۔ ان میں سے اکثر خود بھی ادیب اور عالم تھے اور بالعموم اُن جملہ علوم کے نمائندوں کو، جن کی اسلام کے عقائد راسخہ اجازت دیتے تھے، اپنے ہاں بُلانے اور اُن کی سرپرستی کرنے میں کوشاں رہے۔ اس مقصد کی تکمیل معاشی خوش حالی اور ان علاقوں میں مسلمانوں کی ازسرِنو بحالی نے کردی جو محاربات صلیبی کا براہِ راست نشانہ بنے تھے۔ یہاں اس عہد کے علما اور اہلِ قلم کی فہرست دینے کی ضرورت نہیں۔ مؤرّخین اور جغرافیہ نویسوں کے نام مآخذ کی فہرست میں ملیں گے۔ شفا خانوں میں طبیبوں اور عالموں کو جو امداد دی جاتی تھی اس کی اہمیت ابن القفطی اور ابن ابی اُصَیبِعہ نے بخوبی جتادی ہے۔ جہاں تک شعرا کا تعلّق ہے (ان میں سے بعض کا مطالعہ Rikabi نے *La Poésie profane sous les Ayyūbides*، ۱۹۴۹ء، میں پیش کیا ہے)۔ مؤرّخ کی توجہ غالباً ان میں سے الامجد بہرام شاہ، جو بذاتِ خود ایوبی تھا، یا ایک عوامی شاعر (شاعر الاسواق) ابن الجزّار (جس کا ذکر ابن سعید کی المُغرِب میں ہے) کی طرف بالخصوص منعطف ہوگی۔ مزید براں اندلس کے اُن متعدّد مہاجرین کو بھی خاص طور پر یاد رکھنا ضروری ہے جو ایوبی مملکتوں میں آبسے تھے۔ اپنے علمی مشاغل کے اعتبار سے یہ لوگ بالکل مختلف شعبوں سے تعلّق رکھتے تھے، مثلاً ابن سَعِید مؤرّخ اور جغرافیہ نویس، ابن مالک نحوی، ابن البیطار عالم نباتات اور ابن العربی مشہور صُوفی تھے.

ایوبیوں نے یمن میں جو حکومت قائم کی اس کی بارے میں یہاں تفصیل کے ساتھ لکھنا ممکن نہیں، یہاں بھی ایوبیوں کی مداخلت یقیناً ویسی ہی نتیجہ خیز تھی جیسی مصر میں۔ ایوبی حکومت نے کسی حد تک ان جھگڑوں کا سدِّ باب کیا جو مختلف فرقوں اور ایسے چھوٹے چھوٹے فرماں رواؤں کے درمیان جاری تھے جن میں سارا ملک بٹا ہوا تھا؛ چنانچہ ایک ایسی سیاسی وحدت پیدا ہوگئی جو ایوبیوں کے بعد بھی قائم رہی۔ اگرچہ ۶۲۹ھ/ ۱۲۳۲ء سے سلاطین ایوبیہ کی جگہ خاندان رُسولیہ نے لے لی تھی، لیکن اس خاندان نے ایوبی حُکّام ہی کے زمانے اور ماحول میں نشوونما پائی تھی اور اس نے انھیں کی روایات کو قائم اور جاری رکھا؛ چنانچہ ایوبی حکومت نے یمن میں ایک بار پھر سنّی مسلک کو رواج دیا اور اس علاقے کو سیاسی، معاشی اور انتظامی اعتبار سے مصر کے ساتھ زیادہ وابستہ کردیا۔ یہاں کا تیسرا ایوبی حکمران اپنے بارے میں خود مختار اموی خلیفہ ہونے کا اعلان کر کے جس عجیب وغریب حرکت کا مرتکب ہوا تھا اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یمن کی آبادی مختلف مذہبی فرقوں میں شدّ ومدّ کے ساتھ منقسم ہوتی چلی جارہی تھی۔ اس مدّعی کا قلع قمع کرنے کے بعد العادل اور الکامل دونوں نے اپنے اس ارادے کا صاف طور پر اظہار کردیا کہ وہ یمن سے دست بردار نہ ہوں گے، چنانچہ الکامل نے خود اپنے ایک بیٹے کو سابق فرماں روا کا جانشین بنایا، بایں ہمہ وہ خاندان رُسولیہ کو تخت نشین ہونے سے باز نہ رکھ سکا۔ البتہ یہ لوگ کم از کم شروع شروع میں اپنے آپ کو بڑے اہتمام سے ایوبیوں کا حلیف ظاہر کرتے رہے۔ آگے چل کر مکّۂ مکرّمہ میں اثر ورسوخ حاصل کرنے کی خاطر ایوبیوں سے جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام باتوں کے باوجود ان کے مابین تجارتی تعلّقات کبھی منقطع نہیں ہوے.

۳- الکامل کی وفات پر ایوبیوں کے حقیقی دورِ حکومت کا خاتمہ ہوجاتا ہے، مگر یہ اضافہ کردینا ضروری ہے کہ آنے والا تنزّل بہت حد تک اس حکومت کی تعمیر وتشکیل ہی میں مضمر تھا۔ الکامل نے اپنے سب سے بڑے بیٹے الصالح ایوب کو

مختصر شجرہ نسب آلِ ایوّب

(پانچ مفصل شجروں کے لیے دیکھیے Zambaur)

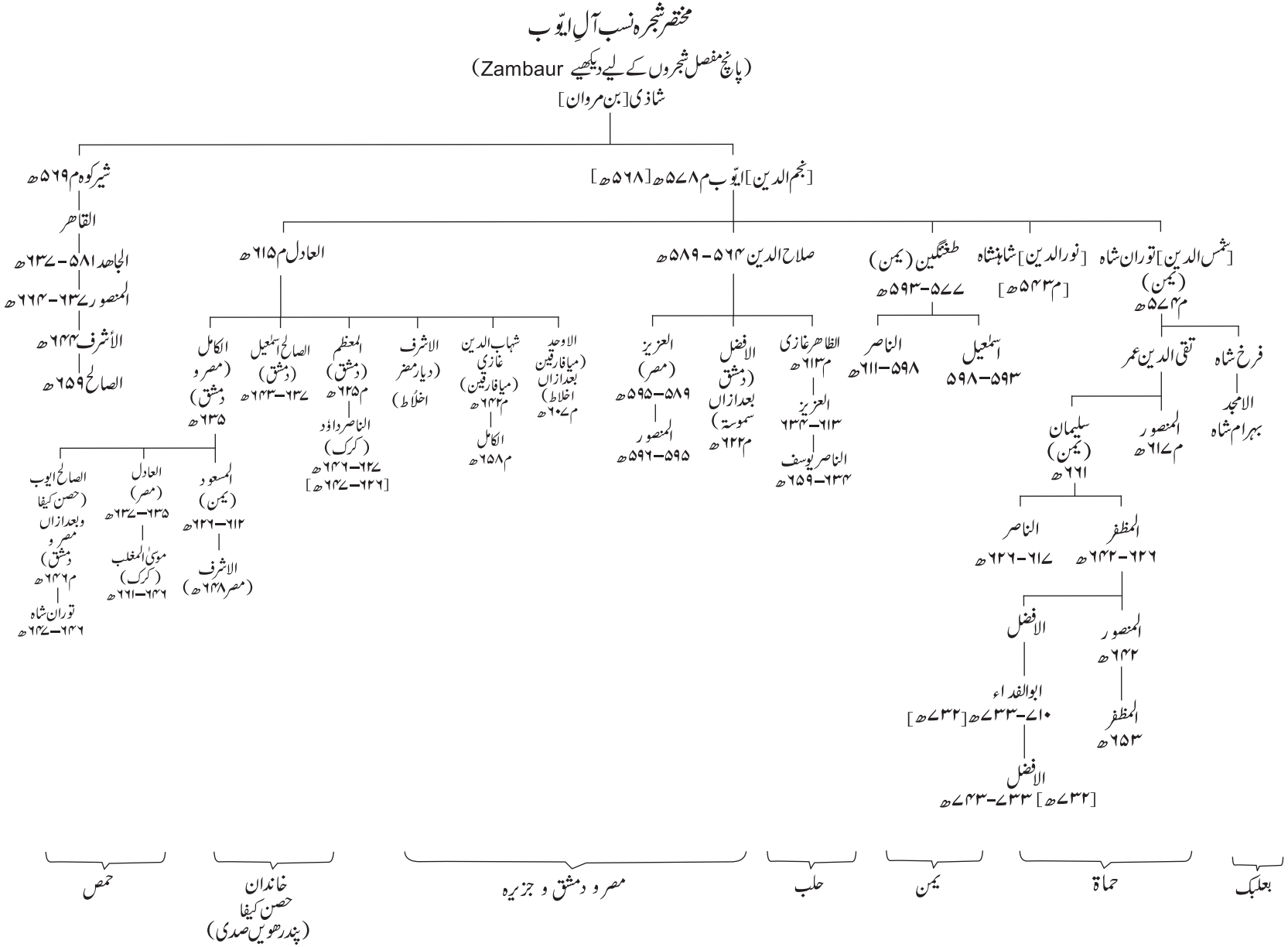

حِصن کَیفا کی حکومت دے کر ٹال دیا تھا اور سب سے چھوٹے بیٹے العادل کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ العادل نے لوگوں کو اپنے سے متنفّر کر دیا اور اس کے مخالفین نے الصالح کے ہاں چارہ جوئی کی۔ الصالح نے خوں ریز لڑائیوں کے بعد، جن میں اسے کئی بار ہزیمت بھی اٹھانی پڑی، بالآخر اپنے ورثے پر قبضہ کر لیا اور اقتدار کی حد تک سے ایوّبی ریاستوں کو ایک بار پھر وحدت عطا کی (مگر یہ وحدت اس کی وفات کی وجہ سے سریع الزوال ثابت ہوئی)۔ اس سلسلے میں اسے اپنے چھوٹے بھائی کے علاوہ شام کے اکثر ایوّبیوں بالخصوص صالح اسمٰعیل کی بھی قربانی دینی پڑی جو دمشق کا مالک بن گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ ایوّبیوں کے درمیان اختلافات پہلے ہی سے موجود تھے لیکن یہ اختلافات ایک تو کسی فریق کو بھی سلطان یعنی خاندان کے بزرگ اعلیٰ سے وہ علاقے حاصل کرنے میں مانع نہیں آتے تھے جن پر وہ حکومت کرتے تھے اور دوسرے وہ اپنے اختلافات کو خاص حدود کے اندر رکھ کر ان کے مضر اثرات سے خاندانی وحدت کو محفوظ رکھتے تھے، لیکن اب مخالفین نے ایک دوسرے کو غاصب قرار دیا، اور الصالح محض قوّت کے بل بوتے پر فتح یاب ہو سکا۔ تاہم اس قوّت کا سرچشمہ پرانی کُردی اور ترکی افواج نہ تھیں۔ الکامل کی زندگی میں الصالح اس لیے معتوب ہوا تھا کہ اس نے مصر میں اپنے والد کی نیابت کرتے وقت کُردوں پر اپنے عدم اعتماد کی وجہ سے محض ترک غلاموں کو بڑے پیمانے پر فوج میں بھرتی کر لیا تھا۔ مصر کا مالک بننے کے بعد جو فوج اس نے تیار کی وہ بھی خالصۃً ترکی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی کامیابی ایک اَور بھی زیادہ پریشان کن عنصر کی مرہون منت تھی، یعنی خوارزمی، جو جلال الدّین کی شکست اور وفات کے بعد ایشیائے کوچک سے، جہاں انھوں نے کچھ مدّت تک آل سلجوق کی خدمات سرانجام دی تھیں، دھکیل دیے گئے تھے اور اب انھیں ایک آقا اور ایک وطن کی تلاش تھی۔ الصالح نے دیارِ مُضر ان کے سپرد کیا اور الجزیرہ اور شام میں اپنے دشمنوں کے خلاف لڑنے کے لیے انھیں طلب کیا۔ ایک حد تک انھیں لوگوں کی بدولت یہ لڑائیاں تباہ کن اور ہولناک ثابت ہوئیں...۔ اگرچہ سابقہ ایوّبی فرماں رواؤں نے فرنگیوں سے صلح و امن برقرار رکھا تھا بلکہ ایک موقع پر تو الکامل نے اپنے بھائیوں کے برخلاف فریڈرک دوم سے اتّحاد بھی کر لیا تھا، تاہم حقیقی معنوں میں یہ منصوبے کبھی عمل میں نہیں آئے۔ اس بار فرنگی الصالح ایوّب اور خوارزمیوں کے مقابلے میں الصالح اسمٰعیل اور الناصر داؤد فرماں روائے کَرَک کے حلیف بن کر سامنے آئے۔ فرنگیوں کی اس طرف داری کا نتیجہ اسمٰعیل اور داؤد دونوں کے حق میں بڑا تباہ کن ثابت ہوا۔ الصالح کے دل میں اس خیال کا آغاز کہ فرنگیوں کے خلاف جنگ ناگزیر ہے یہیں سے ہوا۔ اس کے بعد ایک اَور صلیبی جنگ لڑی گئی، جو سینٹ لوئی (St. Louis) سے منسوب ہے، مگر اس جنگ کے آغاز ہی میں ایوّبی فرماں روا کا انتقال ہو گیا۔

عملی طور پر دیکھا جائے تو الصالح آلِ ایوّب کا آخری فرماں روا تھا۔ اس کا بیٹا تورانشاہ چند ہی ماہ بعد اپنی فوج کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور اگرچہ کچھ عرصے تک متعدّد کم سن بادشاہوں نے ایوّبی خاندان کا نام قائم رکھا، تاہم حقیقت یہ ہے کہ ۶۴۷ھ/۱۲۴۹ء سے مملوک [رک بہ ممالیک] نام کے نئے دورِ حکومت کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس حکومت کی داغ بیل ڈالنے والا درحقیقت الصالح ہی تھا۔ [اس کے عہد میں] ملکی معاملات کی باگ ڈور ترک غلاموں کی اس نہایت مربوط اور منظّم فوج کے ہاتھ میں آ گئی تھی جو دریائے [نیل] کے ایک جزیرے کی بارکوں میں رہنے کی وجہ سے بَحْریّہ [رک بآن] کے نام سے موسوم تھی، الصالح اور تورانشاہ دونوں فوجی قائد نہ تھے۔ اگر تورانشاہ میں توازن کی کمی نہ ہوتی تو شاید اس خاندان کی حکومت کچھ عرصہ اَور باقی رہ جاتی، ورنہ یہ چیز بالکل صاف نظر آ رہی تھی کہ زود یا بدیر بحریہ اپنے ہی میں سے کسی قائد کو ترقی دے کر تورانشاہ کو نکال باہر کرے گی۔ آخر تورانشاہ کے قتل کے بعد انھوں نے ایک ترکمان سردار عزّالدین ایبک کو پہلے اتابک اور بعد ازاں سلطان بنا لیا اور معاصرین کے الفاظ میں ''کُردی'' خاندان کی جگہ ''ترکی'' حکومت نے لے لی۔

شمالی علاقوں میں ایوّبی کسی قدر زیادہ مدّت تک باقی رہے لیکن انھیں کوئی مزید کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ ان کی زندگیاں مغول کی آمد آمد کی دہشت کی فضا میں بسر ہوتی رہیں۔ وہ تذبذب کے عالم میں تھے، کیونکہ ایک طرف تو اطاعت قبول کرنے میں انھیں اپنے ختم ہو جانے کا اندیشہ تھا اور دوسری طرف وہ پہلے ہی سے مُسلّح مدافعت سے مایوس ہو چکے تھے؛ تاہم مملوک حکومت کے قائم ہونے پر الناصر فرماں روائے حلب نے ایوّبیوں کی عظمت بحال کرنے کا بیڑا اٹھایا اور مغول کے خطرے کے پیشِ نظر خلیفۂ بغداد کو مفاہمت کی یہ صورت نکالنا پڑی کہ پورے ملک شام پر الناصر کا حق رہے گا اور مملوک سلطان مصر کی حکومت پر قناعت کرے گا لیکن [۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء] میں سقوطِ بغداد کا واقعہ پیش آیا اور [۶۵۸ھ/۱۲۶۰ء] میں مغول حملہ آوروں کے سامنے، جن کی مزاحمت محال معلوم ہوتی تھی، حلب، دمشق اور میّافارقین یا تو فتح ہو گئے یا انھوں نے اطاعت قبول کر لی۔ بدقسمت الناصر کو، جو دوسروں کے برعکس مصر میں پناہ لینے کی جرأت نہ کر سکتا تھا، بالآخر مغول نے گرفتار کر لیا۔ شروع شروع میں تو اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا گیا لیکن جب اسی سال کے آخر میں یہ خبر پہنچی کہ شام میں عَین جالُوت [رک بآن] کے مقام پر مملوکوں نے مغول کو شکست دے دی ہے تو اسے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ آگے چل کر مملوک سلطان بَیْبَرس نے شام فتح کیا تو کَرَک کی ریاست کو، جو [۶۴۶ھ/] ۱۲۴۸ء میں داؤد کے خاندان کے قبضے سے پہلے ہی نکل چکی تھی اور جسے دفاعی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل تھی، مطیع کر لیا گیا۔ حلب اور حِمص کی ریاستیں اپنی ہی مرضی سے ختم ہو گئی تھیں، صرف حَماۃ کی ریاست کو، جس نے اپنے فرماں روا ابوالفداء [رک بآن] کے باعث، جو ایک عظیم مصنّف بھی تھا، شہرت پائی، بحال کیا گیا اور یہ اپنی کامل اطاعت شعاری کی بدولت (صرف ایک وقفے سے قطع نظر) [۷۴۳ھ/] ۱۳۴۲ء تک قائم رہی۔

لیکن اس خاندان کی ایک اَور شاخ ایسی تھی جو حِصن کَیفا کے نواح میں دو صدیوں تک مغول اور ان کے جانشینوں کے زیر نگیں قائم رہی۔ اس کی حیثیت گھٹ کر محض ایک مقامی جاگیرداری کی رہ گئی تھی۔ یہاں اس ریاست نے عجیب طریقے سے اپنی قدیم روایت کی طرف مراجعت کی، یعنی یہ کہ اس کی قوّت کا دار و مدار ان کُرد قبائل پر تھا جو اس علاقے میں بہت طاقت ور ہو گئے تھے اور یہ ریاست ان قبائل کے باہمی

جھگڑے چکانے میں بار بار حَکَم اور ثالث بننے کی کوشش کرتی رہی۔ تیمور کے حملے سے جو مصیبت عُظمٰی نازل ہوئی اسے یہ ریاست جھیل گئی اور اس نے اپنا ایک ثقافتی مرکز بدستور قائم رکھا لیکن بالآخر آق قویونلو کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے باوجود آل عثمان کی فتح کے وقت اس خاندان کے بعض ارکان کو مقامی طور پر دوبارہ کچھ اہمیت حاصل ہوگئی تھی (قب Cl.Cahen: Contribution á l' Histoire de Diyār Bakr au XIVe Siécle، در JA، ۱۹۵۵ء)۔

مآخذ: (الف) بنیادی مآخذ: (۱) دورِ ایوّبی کی بعض قدیم دستاویزات محفوظ رہ گئی ہیں؛ سرکاری دستاویزات جن کے متعلّق کہا گیا ہے کہ وہ کوہ سینا میں ہیں (عطیہ A. S. Atiya: The Arabic Mss. of Mt. Sinai، بالٹی مور (Baltimore) ۱۹۵۵ء)، یا جو اطالوی محافظ خانوں (archives) میں دریافت ہوئیں اور شائع ہو چکی ہیں (M. Amari: Diplomi Arabi del Archivo Fiorentino، ۱۸۶۳-۱۸۶۷ء؛ Tafel و Thomas: Urkunden zur älteren Handelsgeschichte venedig، تین جلدیں، ۱۸۵۶ - ۱۸۵۷ء)؛ قب نیز صُبْحُ لَبِیْب، جس کا حوالہ اوپر متن میں آچکا ہے؛ (۲) نجی دستاویزات جو قاہرہ اور وی انا وغیرہ میں کاغذات کے مجموعوں میں محفوظ ہیں (قب مثلاً A. Dietrich: Eine Eheurkunde aus der Aiyubidenzeit، در Doc. islam ined، Berlin Akad. Wiss. ۱۹۵۲ء)؛ (۳) مزید براں حسب ذیل لوگوں کے مکتوبات کی نقول جزوی طور پر بعض مجموعوں میں محفوظ ہیں: قاضی الفاضل کے مکتوبات، اس کے بارے میں دیکھیے: A. N. Helbig: Der Ḳāḍi āl-Fāḍil، ۱۹۰۹ء، لیکن اس میں مکمل معلومات نہیں ہیں، ایوبی فرماں روا الناصر داؤد کے مکتوبات (براکلمان، ۱: ۳۱۸ و Cl. Cahen، در REI، ۱۹۳۶ء، ص ۳۴۱) اور الأفضل کے وزیر ضیاء الدین ابن الأثیر کے مکتوبات، ان مخطوطات کا تجزیہ از Margoliouth، مستشرقین کی دسویں مؤتمر میں، حبیب زیّات، در المشرق (Machriq)، ج ۳۷، عدد ۴، ۱۹۳۹ء؛ اور Cl. Cahen، در BSOAS، ج ۱۴، عدد ۱)؛ اوّل الذّکر کے متعدّد اقتباسات ابوشامہ کے ہاں بھی ملتے ہیں، جس کا حوالہ نیچے دیا گیا ہے؛ (۴) یہودیوں کی متعدّد دستاویزات قاہرہ کے جنیزہ کے مجموعوں میں؛ (۵) بحیثیت مجموعی ہمارے لیے اہم مآخذ وہ کتابیں ہیں جو واقعاتی اندازِ بیان کی حامل ہیں، جن پر جامع تنقیدات کا ذکر مقدمات از Cl. Cahen: La Syrie du Nord à l'époque des Croisades، ۱۹۴۰ء و H. Gottschalk: al-Malik al-Kāmil میں ملتا ہے، صلاح الدّین کے زمانے کے بارے میں: (۶) H. A. R. Gibb: The Arabic Sources for the Life of Saladin، در Speculum، ج ۲۵، عدد ۱، ۱۹۵۰ء، اس پہلے دور کے لیے بڑا ماخذ ہے: (۷) عمادالدّین الاصفہانی: البَرْق الشامی، جس کے دو اجزا اوکسفرڈ میں موجود ہیں (قب H. A. R. Gibb، در WZKM، ج ۵۲، ۱۹۵۳ء) لیکن اس کے تقریباً مکمل خلاصے بعد میں لکھی جانے والی کتابوں میں موجود ہیں، بالخصوص ابوشامہ: کتاب الرَّوْضَتَیْن، قاہرہ ج اوّل ۱۲۸۷ھ اور ج دوم ۱۲۸۸ھ (حلمی محمد احمد کی ایک نئی تحقیقی طباعت کا پہلا حصّہ ۱۹۵۶ء میں قاہرہ سے شائع ہوا۔ اس میں ۵۵۸ھ/۱۱۶۳ء تک کے حالات موجود ہیں)، اس کے اقتباسات Hist. Or. Crois.، ج ۴ و ۵ میں ملیں گے؛ اس کی تکمیل عمادالدّین کاتب: الفتح القُسّی، طبع C. Landberg، مطبوعۂ مصر ۱۳۲۲ھ سے ہو سکتی ہے، جس میں ۱۱۸۷ء کے واقعات درج ہیں (قب J. Kraemer: Der Sturz des Königreichs Jerusalems in der Darstelling des... طبع Wiesbaden ۱۹۵۲ء)؛ دوسرے اہم عربی مآخذ حسب ذیل ہیں: (۸) ابن شدّاد: النوادر السلطانیۃ، مصر ۱۳۱۷ھ یا سیرۃ صلاح الدّین الایوبی، انگریزی ترجمہ Life of Saladin، در Hist. Or. Crois.، ج ۳؛ (۹) ابن ابی طَیّ، جس کا حوالہ ابوشامہ نے اپنی مذکورۂ بالا کتاب میں دیا ہے؛ (۱۰) البُستان الجامع، طبع Cl. Cahen، در BEO، دمشق ۱۹۳۷ء اور (۱۱) مسیحی مصنّف ابو صالح ارْمَنی: Churches وغیرہ، طبع Evetts۔ ساتویں/تیرھویں صدی کے آغاز کے لیے: (۱۲) ابن الاثیر: الکامل، بنیادی عربی مآخذ بن گیا ہے۔ اس میں (۱۳) ابن ابی الدمّ (اوکسفرڈ مخطوطات Marsh، شمارہ ۳۶۰) کے آخری صفحات؛ (۱۴) ابن نَظِیف (مخطوطۂ لینن گراڈ، شمارہ IM ۱۵۹، طبع H. Gottschalk، چند اقتباسات در Amari: Bibliotheca Arabo Sicula، ج ۲ ضمیمہ جات جس سے ابن الفرات (سطور زیریں) نے مسلسل استفادہ کیا ہے)؛ اور (۱۵) عبداللطیف کے تذکرے کے اقتباسات کا، جو تاریخ الاسلام از ذہبی اور اگلے دَور سے متعلّق مصنّفین نے دیے ہیں، اضافہ ضروری ہے۔ ساتویں/تیرھویں صدی کے ایوّبیوں کے لیے بحیثیت مجموعی اور ۱۲۲۰ء کے واقعات کے لیے بطورِ خصوصی بنیادی مآخذ: (۱۶) ابن واصل: مُفَرِّج الکُرُوْب فی اخبار بنی ایوب ہے، دیکھیے براکلمان، ۱: ۳۲۳؛ تکملہ، ۱: ۵۵۵ (اس کی طبع کی ذمے داری الشیّال نے اٹھائی ہے۔ وہ اس وقت تک پہلی دو جلدیں شائع کر چکا ہے، جو صلاح الدّین کی وفات پر تمام ہوتی ہیں۔ اس کے اقتباسات Michaud: Bibliothéque des Croisades، ج ۴ (از Reinaud) میں اور المقریزی کے ترجمے پر Blochet کے ملاحظات میں موجود ہیں، جو ROL، ج ۹-۱۱ میں طبع ہوئے)۔ یہ کتاب اور (۱۷) سبط ابن الجوزی: مِرآۃ الزّمان (عکسی طبع از Jewett، جس کی بنا پر حیدر آباد دکن، ج ۲، ۱۹۵۲ء کا غیر مکمل اڈیشن طبع ہوا ہے، قب Arab.، ۱۹۵۷ء/ ۲، تبصرہ از Cl. Cahen)، جو دمشق کے سلسلے میں بالخصوص اہم ہیں، دو ایسے مآخذ ہیں جنھیں آنے والے مؤرخوں نے خاص طور پر استعمال کیا ہے؛ (۱۸) ابوالفداء: المختصر فی اخبار البشر] نے، بیشتر اپنے اس کم تر درجے کے معاصر ہی کی تصنیف نقل کی ہے؛ (۱۹) ابن الواصل نے قبل ازیں ایک زیادہ مختصر التأریخ الصالحی لکھی تھی، جو مختلف ذرائع سے حاصل کردہ معلومات پر مبنی تھی (یہ ابھی تک شائع نہیں ہوئی)۔ بنو ایوب پر لکھنے والوں کی فہرست میں حسب ذیل کا خاص طور سے اضافہ کرنا چاہیے: (۲۰) ابوشامہ: الذیل علی الرَّوْضَتَیْن، قاہرہ ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء؛ (۲۱) مسیحی مصنّف المَکِین بن العَمِید (طبع در BÉt. Or.، ۱۹۵۸ء از Cl. Cahen): History of the Patriarchs of Alexandtra، اقتباسات کے لیے دوسری کتابوں کے علاوہ دیکھیے: Blochet، المقریزی: کتاب مذکور؛ (۲۲) سعدالدّین کے اقتباسات (Cl. Cahen: Une source pour l'Histoire des Croisades, les Memoires de..، در Bull. Fac. Lettres Strasbourg، ج ۲۸، عدد ۷، ۱۹۵۰ء)؛ شمالی شام کے لیے: (۲۳) کمال الدّین ابن العدیم: زُبْدۃ، دیکھیے ترجمہ از بلوشے (Blochet)، در ROL، ج ۴-۶) اور (۲۴) وہی مصنّف: بُغْیَۃ اور عزّالدین شدّاد (آگے آتا ہے)؛ عراقی کا نقطۂ نظر ذیل کی کتاب میں ملے گا: (۲۵) ابن الفُوَطی: الحوادث الجامعۃ طبع مصطفٰی جواد؛ الخوارزمی کا نقطۂ نظر: (۲۶) النَّسَوی Vie de Djalāl al-Din، طبع و ترجمہ از Houdas میں؛ اور (رُوم کے) سلجوقیوں کے لیے: (۲۷) ابن بی بی، طبع Houtsma (فارسی میں اسے کسی قدر مختصر کر دیا گیا ہے)۔ نیز دیکھیے مغول اور ابتدائی مملوک فرماں رواؤں کے مؤرّخین۔ مابعد کے جن عرب مؤرّخین نے اصل مواد محفوظ رکھا ہے ان میں ذیل کے مصنّفین قابل ذکر ہیں: (۲۸) الجزری (Cl. Cahen، در Oriens، ج ۴، عدد ۱، ۱۹۵۱ء، ص ۱۵۱ - ۱۵۳)؛ (۲۹) الذّہبی، زیر طبع؛ (۳۰) النُّوَیْری: نہایۃ الارب (مطبوعۂ قاہرہ)؛ (۳۱) ابن الفرات؛ (۳۲) المقریزی: السلوک، طبع مصطفٰی زیادہ؛ (۳۳) الخِطَط، مطبوعۂ بولاق۔ اس کے ابتدائی حصّے کے

لیے طبع Wiet کا ایڈیشن ہی بہترین ہے۔ یمن کے ایوّبی عہد کے لیے: شہرۂ آفاق (۳۴) الخزرجی (طبع و ترجمہ در سلسلۂ یادگار گب) سے جو بعد کے زمانے سے تعلّق رکھتا ہے؛ (۳۵) ابن مُجاوِر (طبع Lögfren)، جو ہم عصر ہے؛ اور (۳۶) ہمدانی (براکلمان، ۱: ۳۲۳، غیر مطبوعہ) کہیں بہتر ہیں۔ ریاست حِصن کَیفا کے بارے میں: (۳۷) نامعلوم الاسم مصنّف: مخطوطہ وی انا۔ جس کے تبصرے کے لیے دیکھیے: Cl. Cahen: *Contributions* etc.، حوالۂ مندرجۂ بالا؛ (۳۸) پورے ایوّبی خاندان کی عمومی تاریخ ایک نامعلوم الاسم شامی نے نویں/پندرھویں صدی میں لکھی تھی (Brit. Mus. Add.، شمارہ ۷۳۱۱، غیر مطبوعہ)۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے اہم مآخذ ابھی تک مخطوطوں کی صورت میں ہیں اور ان کی اشاعت کی شدید ضرورت ہے، خواہ وہ سر دست عکسی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ عربی مؤرّخوں کے اقتباسات کے تراجم: (۳۹) F. Gabrieli: *Storici arabi delle Crociate*، روما ۱۹۵۷ء؛ اور (۴۰) J. ф strup: *Arabiske Kroniker til Korstogenes Periode*، کوپن ہیگن ۱۹۰۶ء میں ملیں گے۔

مؤرّخوں کے ساتھ سوانح نگاروں کو بھی شامل کرنا ضروری ہے؛ صرف (۴۱) ابن خَلّکان: وفیات ہی نہیں؛ بلکہ (۴۲) ابن القِفطی: تاریخ الحکماء (طبع Lippert [لائپزگ ۱۳۲۰ء])؛ اور (۴۳) ابن ابی اُصَیبِعَہ (طبع Aug. Müller) بھی۔ اسی طرح جغرافیہ نویس بھی شامل کرنا چاہییں، مثلاً (۴۴) یاقوت؛ (۴۵) ابن سعید (غیر مطبوعہ)، اور بالخصوص (۴۶) عزّالدّین بن شدّاد، شمالی شام، طبع Ledit، در المشرق (*Machriq*)، ۱۹۳۵ء؛ حلب، طبع Sourdel، دمشق ۱۹۵۸ء؛ دمشق، طبع الدہان ۱۹۵۷ء؛ جزیرہ، تجزیہ از Cl. Cahen، در *REI*، ۱۹۳۴ء مزید اقتباسات از Sobernheim، در *Centenario di Amari*، ج ۲ (بعلبک)، و در *Corpus Inscriptionum Arab.*، بمواضع کثیرہ)۔ تاریخی اور انتظامی کوائف کی تکمیل کے لیے دیکھیے: (۴۷) سبط ابن العَجَمی: *Les Trésors d' Or.*، تجزیہ و ترجمہ از Sauvaget، ۱۹۵۰ء، اور (۴۸) عُلَیمی: *Description de Damas*، طبع Sauvaire، در *JA*، ۱۸۹۴ء۔

نظم و نسق سے متعلّق رسائل کا حوالہ بھی ضروری ہے (علاوہ ان اقتباسات کے جو المَقرِیزی کے ہاں محفوظ ہیں) دیکھیے: (۴۹) ابن المَمّاتی: قوانین الدّوانین (طبع عطیّہ، ۱۹۴۳ء)؛ (۵۰) ابن شیث القرشی: معالم الکتابۃ، طبع خُوری قسطنطین پاشا، ۱۹۱۳ء؛ اور (۵۱) النابُلسی کے کتابچے: اخبار الفَیُّوم طبع B. Moritz، قبّ Cl. Cahen: *Les Impôts* etc.، جس کا حوالہ اوپر آ چکا ہے؛ اور (۵۲) لَمع القوانین، طبع Cl. Cahen، جو جلد شائع ہوں گے، اقتباسات از C. Owen، در *JNES*، ۱۹۳۵ء؛ اور آخر میں (۵۳) الشَّیزَری، نہایۃ الرتبۃ؛ اور (۵۴) صنعت سے متعلّق رسائل، مثلاً توپ سازی کے متعلّق اور مالیات کے بارے میں رسائل مصنفہ ابن بعرہ، تجزیہ از Ehrenkreutz، در *Contributions* etc.، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے؛ (۵۵) مقالہ نگار کو ذاتی طور پر تذکرۃ فی الحِیل الحربیّۃ سے واقفیت نہیں، جو علی الہَرَوِی نے الظاہر غازی کے نام مُعَنوَن کیا تھا (Rescher، در *MFOB*، ج ۵، ۱۹۱۲ء: ص ۴۹۵، طبع زیر ترتیب از J. Sourdel Thomine)؛ شعرا کے دواوین بھی نظر انداز نہیں کرنے چاہییں۔

قدرتی طور پر غیر عربوں اور غیر مسلموں کی تصانیف بھی دیکھنی چاہییں، اُن کی تفصیل تو یہاں نہیں دی جا سکتی، ہاں خاص طور پر محاربات صلیبی کے لاطینی اور فرانسیسی مؤرّخین اور سریانی ادب: (۵۶) میخائیل الشامی، طبع و ترجمہ Chabot؛ (۵۷) ابن العبری، طبع و ترجمہ Budge؛ (۵۸) *Chronique anonyme syriaque*، طبع Chabot، در *Corpus Script Or.*، ۳: ۱۴-۱۵) کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

کتبات کے بارے میں: (۵۹) *RCEA*، ج ۷-۹، میں مواد جمع کیا گیا ہے اور صلاح الدّین کے کتبات کے بارے میں: (۵۹) Weit نے *Syria*، ج ۳، میں اپنے مطالعے کے نتائج پیش کیے ہیں۔ سکّوں کے متعلّق مواد عام فہرستوں میں مل جاتا ہے، البتہ ان میں (۶۰) Balog، Minost اور Jungfleisch کی تازہ ترین تحقیقات کا اضافہ کر لیجیے، جو ۱۹۵۰ء کے بعد *MIE* میں شائع ہوئی ہیں]۔

(ب) جدید تصانیف: ایوّبیوں کے بارے میں کوئی مکمّل اور مجموعی تاریخ موجود نہیں۔ عام حالات کے بارے میں دو تصنیفات بہترین ہیں اگرچہ مختصر ہیں، یعنی (۶۱) G. Weit: *Histoire de la Nation Egyptienne*، طبع Hanotaux، ج ۴؛ اور (۶۲) H. A. R. Gibb: *History of the Crusades*، (فلاڈلفیا)، ج ۱ (صلاح الدّین)، ۱۹۵۵ء و ج ۲ (آل ایوّب بعد از صلاح الدین)، حتّٰی کہ صلاح الدّین کی بھی کوئی ایسی سوانح عمری نہیں ملتی جسے پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ لکھا گیا ہو۔ اس سلسلے میں آخری کوشش (۶۳) A. Champdor کی ہے، جو پیرس سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی ہے۔ اور ابھی تک (۶۴) لین پول (نیو یارک ۱۸۹۸ء) کی کتاب ہی ایسی ہے جس پر کم سے کم اعتراضات کیے جا سکتے ہیں۔ دوسرے ایوّبی فرماں رواؤں میں سے صرف الکامل حال ہی میں ایک اہم تصنیف کا موضوع بن سکا ہے، اس کا مصنّف (۶۵) H. Gottschalk ہے، اسی مصنّف نے یمن در عہدِ آل ایوّب پر ایک مقالہ لکھنے کا اعلان کیا ہے۔ متعدّد مخصوص مسائل پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کے حوالے متن میں آ چکے ہیں۔ جہاں تک تجارت کا تعلّق ہے دو قدیم مستند تصانیف، یعنی (۶۶) W. Heyd: *Histoire du Commerce du Levant*، ج ۱، ۱۸۸۲ء؛ اور (۶۷) Schaube: *Handelsgeschichte der Mittelmeerro-manen*، ۱۹۰۶ء کے علاوہ، جن میں ان مسائل کو مغربی زاویۂ نظر سے پرکھا گیا ہے، مقالہ نگار کی رائے میں کسی نئی کتاب کا اضافہ نہیں ہوا۔ انتظامی اداروں کے بارے میں کچھ معلومات (۶۸) W. Björkman: *Beiträge zur geschichte der Staats-kanzlei im islamischen Ägypten*، ہمبرگ ۱۹۲۹ء میں مل جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں محاربات صلیبی اور بلادِ مشرق کے لاطینی مقبوضات کے مؤرّخین سے بھی رجوع کیجیے۔ اسی طرح الگ الگ فرماں رواؤں سے متعلقہ مقالات میں دیے ہوئے مآخذ دیکھیے؛ نیز (۶۹) مادّہ مسجد میں جو حصّہ مدرسے کے بارے میں ہے؛ نیز دیکھیے (۷۰) ابو حدید محمد فرید: صلاح الدین (عربی)، اردو ترجمہ از محمد عبدالقدوس القاسمی، لاہور، تاریخ طبع ندارا؛ (۷۱) بہاء الدّین: *Saladin*، لنڈن ۱۸۹۷ء؛ (۷۲) ابن خلدون: العبر؛ (۷۳) ابن جبیر: رحلۃ؛ (۷۴) ابن دحلان: الفتوحات الاسلامیۃ؛ (۷۵) اسمٰعیل سرہنگ: حقائق الاخبار عن دول البحار، بولاق ۱۳۱۲ھ؛ (۷۶) السیوطی: حسن المحاضرۃ؛ (۷۷) البستانی: دائرۃ المعارف، بذیل مادّۂ ایوّبی؛ (۷۸) سید علی الحریری: الحروب الصلیبیۃ، مصر ۱۳۲۹ھ؛ (۷۹) محمود فہمی: البحر الزاخر، مصر ۱۳۱۲ھ؛ (۸۰) فرید وجدی: دائرۃ المعارف القرن العشرین؛ (۸۱) القلقشندی: الصبح الاعشٰی؛ (۸۲) احمد بیلی: فاتح بیت المقدس، اردو ترجمہ، منڈی بہاء الدین؛ (۸۳) رشید اختر ندوی: صلاح الدین، لاہور ۱۹۵۴ء؛ (۸۴) فصیح الدّین احمد: سوانح سلطان صلاح الدین اعظم، لاہور تاریخ طبع ندارد۔

(CL. CAHEN [و ادارہ])

———————————

ب

* **با:** (= بُو) نسب کو ظاہر کرنے کے لیے ایک کلمہ، جو جنوبی عرب میں، بالخصوص حضر موت کے سادات و مشائخ میں، مفرد اسما اور (ثانوی طور پر) اسم جمع بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً باعبّاد، باعلوی، بافَضل، بافقیہ، باحَسَن، باحسّان، باہُرمُز، باوزیر (دیکھیے Nallino کے خاص مقالات اور اس کی فہرستیں در Gabrieli: *Nome proprio*، ص ۸۸ اور van den Berg: *Ḥadhramout*، ص ۵۱-۶۱)۔ ابن المُجاور (طبع Löfgren، ص ۲۵۴) نے بھی اس حضرمی نظامِ تسمیہ کی تفصیلات دی ہیں۔ ابن مُجاوِر اور الشَّرجی (طبقات الخواص، بمواضع کثیرہ) قدیم متروک شکل ابا استعمال کرتے ہیں، لیکن دوسرے مصنّفین اسے ابو، ابی یا ابا لکھتے ہیں اور با کو ترک کر دیتے ہیں۔ اس طرح شخص واحد کا نام باحَسّان، اباحسّان، ابوحسّان اور حسّان کے طور پر لکھا جاتا ہے (ابن حسّان کے لیے دیکھیے نیچے).

یوں اصلی ''با'' غیر منصرف لفظ ''ابا'' (بمعنی باپ) کے مترادف ہو جاتا ہے، جس سے انفرادی (بعض اوقات فرضی) کنیتیں بن جاتی ہیں، حالانکہ یہ یاے نسبتی کا یا (مغربی یمن میں رائج) لفظ ذو کا کام دیتا ہے۔ ابن المجاور؛ الشِلّی (مَشْرَع، ۱: ۲۸)؛ السقّاف (تاریخ الشعراء الحضرمیین، ۱: ۵۳، حاشیہ) اور فلوگل (در *ZDMG*، ۹: ۲۲۷) کی رائے بھی یہی ہے۔ کبھی قبیلہ یا خاندان ظاہر کرنے کے لیے با سے پہلے ''آل'' یا اولاد لگا دیا جاتا ہے، مثلاً آل باعلوی، اولاد باقُشَیر، جسے وُسٹینفلٹ (Wüstenfeld) نے بھی درست قرار دیا (*Geschichtsschreiber*، ص ۲۵۶؛ *Çufiten*، ص ۴، حاشیہ ۱).

ترکیب با سے ایک اَور ترکیب کو، جو بَل (بعض اوقات بِل) مشتق از بن اَل سے بنتی ہے، ممیّز کرنا ضروری ہے؛ مثلاً بَل فقیہ (جو مذکورۂ بالا بافقیہ کے مترادف نہیں) = ابن الفقیہ (السقّاف: کتاب مذکور، ۲: ۵۴، حاشیہ ۲)، بَل حاجّ (بافَضل خاندان کے ارکان کا لقب) = ابن الحاجّ۔ با والے ناموں کے لیے اسم وحدت (nomen unitatis) کے طور پر یاے نسبت کے ساتھ ساتھ بن کا استعمال بھی ہوتا ہے (جس کی تصدیق فان ڈِن برگ (van den Berg، محل مذکور) نے کی ہے)، اور اسی طرح با ابوحسّان کی جگہ ابن حسّان کا استعمال بھی ہے (قب *MO*، ۲۵: ۱۳۱، اور *BSOAS*، ۱۳: ۲۹۱-۲۹۹).

مآخذ: (۱) المُحِبّی: خلاصة الأثر، ص ۱-۴؛ (۲) van den Berg: *Le Ḥadhramout el ses colonies Arabes*، بٹاویا ۱۸۸۶ء؛ (۳) G. Gabrieli: *Ilnome proprio arabo-musulmano*، روما ۱۹۱۵ء؛ (۴) الشِلّی: المَشْرَع الرَّوِی، ص ۱-۲؛ (۵) R. R. Serjeant: *The Saiyids of Ḥadhramawt*، لنڈن ۱۹۵۷ء.

(O. LÖFGREN)

---

* **با:** (= الباء) رک بہ ہجاء.

---

* **باب:** (دروازہ) اس موضوع کو دو عنوانوں کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے: (۱) مساجد وغیرہ میں؛ (۲) قلعوں میں.

(۱) مساجد اور مقابر وغیرہ میں: تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے آخر تک کسی مسجد میں داخلے کا دروازہ عظیم الشان اور پائدار نہ تھا۔ تمام چھوٹی بڑی مسجدوں میں احاطے کی دیوار میں مستطیل شکل کے سادے سے دروازے تھے، مثلاً مساجدِ ذیل میں: (۱) مسجد قصر الحَیر الشرقی، ۱۱۰ھ/۷۲۹ء؛ (۲) حَرّان کی بڑی مسجد کا مدخل، تقریباً ۷۴۴-۷۵۰ء؛ (۳) مسجد قُرطُبہ، ۱۷۰ھ/۷۸۷ء؛ (۴) مسجد عمرو [بن العاصؓ]، ۲۱۲ھ/۸۲۷ء؛ (۵) قیروان کی بڑی مسجد کے دو مَدْخل، جو ۲۲۱ھ/۸۳۶ء سے چلے آ رہے ہیں؛ (۶) سوسہ کی مسجد بُوفتاتا، ۲۲۳ھ/۸۳۸ء-۲۲۶ھ/۸۴۱ء؛ (۷) سُوسہ کی بڑی مسجد، ۲۳۶ھ/۸۵۰-۸۵۱ء؛ (۸) سامرّا کی بڑی مسجد، ۲۳۴ھ/۸۴۸ء-۲۳۷ھ/۸۵۲ء؛ اَبودُلَف کی جامع مسجد، ۲۴۷ھ/۸۶۱ء اور (۹) مسجد ابن طُولُون، ۲۶۳ھ/۸۷۶ء-۲۶۵ھ/۸۷۹ء شاندار دروازے والی سب سے پہلی مسجد فاطمیوں نے خلیج قابِس پر المَہدیّہ (تصویر ۱) کی تعمیر کے وقت ۳۰۸ھ/۹۲۰-۹۲۱ء میں تعمیر کرائی۔ اس طرح کی محرابیں آج کل کی بہ نسبت ۹۲۰ء میں شمالی افریقہ میں بہت زیادہ تعداد میں موجود ہوں گی.

دروازوں کی یہ طرزِ تعمیر فاطمیوں ہی کی وساطت سے مصر میں آئی، جہاں یہ مسجد الحاکم (۳۹۳ھ/۱۰۰۳ء) میں نظر آتی ہے، لیکن زیادہ بڑے پیمانے پر (اس کی چوڑائی ۵۰ء۱۵ میٹر اور اس کا آگے کو نکلا ہوا حصّہ (projection) ۱۶ء۶ میٹر ہے، بمقابلہ باب مسجد مہدیۃ ۳×۸ میٹر)۔ یہ طرزِ تعمیر مسجد الاَقمر ۵۱۹ھ/۱۱۲۵ء میں بہت چھوٹے اور مسجد بیبرس (تصویر ۲) ۶۶۵ھ/۱۲۶۶ء-۶۶۷ھ/۱۲۶۹ء میں زیادہ بڑے پیمانے پر (۸۶ء۸×۸۳ء۱۸ میٹر) نظر آتی ہے۔

مؤخّر الذکر کے پہلو تین محراب دار چوکھٹوں سے مزیّن کیے گئے ہیں۔ الحاکم کی مسجد میں ایسی دو چوکھٹیں (panels) ہیں جب کہ مہدیہ کی مسجد میں صرف ایک ہے۔

لیکن اسی زمانے میں شام میں ایک نئی طرز یعنی آویزدار (stalactite) دروازے کا آغاز ہوا، اس کی سب سے پہلی مثال حلب کے مدرسۂ شاد بخت کا دروازہ ہے (تصویر ۳)، جو ۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کے بعد کئی اَور عمدہ نمونے بنائے گئے، مثلاً (۱) حَلَب کی رباط ناصری (تصویر ۴)، (۶۳۵ھ/ ۱۲۳۷-۱۲۳۸ء)؛ (۲) دمشق کی جامع التّوبہ، (۶۳۲ھ/ ۱۲۳۴-۱۲۳۵ء) وغیرہ۔

مصر میں یہ طرز تعمیر پہلے مدرسۂ بیبرس (۶۶۲ھ/ ۱۲۶۴ء) میں اور پھر مدرسہ و مقبرۂ زین الدّین یُوسف (تصویر ۵)، (۶۹۸ھ/ ۱۲۹۹ء) میں اختیار کی گئی، لیکن چودھویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک اس کا مصر میں رواج عام نہیں ہوا تھا، کیونکہ چودھویں صدی عیسوی کے اوائل کی ایسی متعدد یادگاریں اب تک موجود ہیں جن میں یہ طرز تعمیر استعمال نہیں ہوئی۔

یادگار قسم کے اِن خوش نما دروازوں کے آغاز کا سُراغ لگانا ناممکن ہے، اس لیے کہ بظاہر ان کے ارتقا کی ابتدائی صورتیں ناپید ہو چکی ہیں، تاہم گمانِ غالب یہ ہے کہ یہ طرز شاہی دروازوں، مثلاً سامرّا کے بیت الخلیفہ کے بغلی (lateral) دروازوں سے لی گئی ہوگی، جن کے گہرے طاق نما دروازوں کے اوپر ایک ایک نیم گنبد بنا ہے، جن کے دو مثلّث مدخل ایسے طویل ہیں کہ ان کی نیمہ گنبد چھت سہاروں (squinches) پر قائم ہے۔ اس طرز کے پیش نظر یہ بات ظاہر ہے کہ آگے چل کر یہ طرزِ تعمیر شام میں آئی تو گنبدوں کو سہارا دینے کے لیے ان مثلث سہاروں کی جگہ وہ ترکیبیں اختیار کی گئی ہوں گی جو وہاں پہلے سے رائج تھیں۔ اس طرز تعمیر کے قدیم ترین نمونے یعنی مدرسۂ شاد بخت کے طاق نما دروازے کا اُس قبے کے آویزوں (pendentives) سے مقابلہ کرنے پر جو قریب قریب اسی زمانے کے تعمیر شدہ حلب کے مشہد حسینؓ (۶۰۸ھ/ ۱۲۱۱-۱۲۱۲ء) کی محراب کے سامنے واقع ہے یہ تحقیق ہو سکتا ہے کہ واقعی ایسا ہوا ہے۔ دونوں صورتوں میں مخصوص شامی طرزِ تعمیر اختیار کی گئی ہے۔ یعنی گوشوں کے آر پار پے در پے افقی ردّے ہیں جو طاقچوں سے مزیّن کیے گئے ہیں اور بخط مستقیم اس طرح لگائے گئے ہیں کہ ایک ردّا دوسرے کی بہ نسبت آگے بڑھا ہوا ہے۔

ایران میں قدیم ترین دروازوں، مثلاً دامغان میں چہل دختران کے مقبرے کا دروازہ (Sarre: *Denkmäler*، شکل عدد ۱۵۶) ۴۴۶ھ/ ۱۰۵۴ء، مراغہ کا گنبدِ سُرخ (pope: *Survey*، لوحہ عدد ۳۴۱ ؎؛ اور Godard در آثارِ ایران، حصّۂ اوّل، شکل عدد ۸۹) ۵۴۲ھ/ ۱۱۴۸ء اور نخجوان میں مؤمنہ خاتون کا مقبرہ (تصویر ۶)، (وہی مصنف لوحہ عدد ۳۴۵ اور Sarre: کتاب مذکور، لوحہ عدد ۳، جس کی نقل یہاں درج ہے، لوحہ عدد XXVII ب = تصویر ۵)۔ ۵۸۲ھ/ ۱۱۸۶ء کے مدخل مستطیل ہیں، جن کی بالائی چوکھٹ کے اوپر ایک محراب (tympanum) اور اس کے اردگرد ایک کم گہرائی کا مستطیل طاق۔ بظاہر اس طرز تعمیر کا اگلا قدم یہ تھا کہ محراب کی جگہ کم گہرائی کا طاق بنا دیا جائے اور اسے آویزوں (stalactites) سے پُر کر دیا جائے، مثلاً خیوف (Khiov) کا بُرجی مقبرہ (Pope: وہی کتاب، لوحہ عدد ۳۴۳) اور ایک اَور سَلْماس کا (وہی مصنف، لوحہ ۳۴۴، جس کی نقل یہاں دی گئی ہے، لوحہ عدد XXVIII ؎ = تصویر ۷)۔ چودھویں صدی عیسوی میں دروازوں نے عام طور پر عملاً کسی چھوٹے لیوان کی طرح ایک بلند قوسی طاق کی شکل اختیار کر لی، جس کے اوپر ایک نیم برج آویزوں (pendentives) کے سہارے قائم کیا جاتا تھا (لیکن مصری شکل سے بالکل مختلف طرز کا) مثلاً نَطَنز [اعمالِ اصفہان کا ایک قصبہ، یاقوت: نَطَنزَہ] کی خانقاہ (وہی کتاب، لوحہ عدد ۳۶۷) ۷۰۴ھ/ ۱۳۰۴-۱۳۰۵ء (وہی مصنّف، لوحہ عدد ۳۶۷)، بِسطام میں شیخ بایزیدؒ کی درگاہ (وہی کتاب، لوحہ عدد ۴۱۶، جس کی نقل یہاں درج ہے، لوحہ عدد XXVIII ب = تصویر ۸) ۷۱۳ھ/ ۱۳۱۳ء، ورامین کی مسجدِ جامع (وہی کتاب، لوحہ عدد ۴۰۶) ۷۲۳-۷۲۶ھ/ ۱۳۲۳-۱۳۲۵ء، اصفہان میں بابا قاسم کا مقبرہ (وہی کتاب، لوحہ عدد ۴۱۷)، ۷۴۱ھ/ ۱۳۴۰ء، کرمان کی بڑی مسجد (وہی کتاب، لوحہ عدد ۵۴۱ ؎)، ۷۵۰ھ/ ۱۳۴۹ء، اور کرمان ہی کی مسجد پامنار ۷۹۴ھ/ ۱۳۹۱ء (وہی کتاب، لوحہ عدد ۴۵۱ ب)۔ پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں بلخ کا وہ قابلِ دید دروازہ بنا جو ابونصر پارسا کے مقبرے میں ہے (وہی کتاب، لوحہ ۴۲۳ و ۴۲۴)۔ یہ دروازہ عمارت کی روکار سے نمایاں طور پر آگے کو بڑھا ہوا ہے۔ اس کے وسطی حصّے میں ایک اونچا محراب دار کھانچا ہے اور داخل ہونے کا راستہ حسب معمول پیچھے کی طرف واقع ہے، لیکن اس کے بازو ۴۵ درجے کے زاویے پر کاٹ دیے گئے ہیں اور دو منزلہ ہیں، ہر منزل میں ایک نکیلی محراب کا طاق ہے۔

اس دروازے کو آسانی سے ہندوستان کے بعض یادگار دروازوں کا نقش اوّل کہا جا سکتا ہے، مثلاً فتح پور سیکری کا بلند دروازہ، ۱۰۱۰ھ/ ۱۶۰۲ء (تصویر ۸ الف) اور جامع مسجد دہلی کا بڑا دروازہ، ۱۶۴۴-۱۶۵۸ء۔

استانبول میں مسجدوں کی ڈیوڑھیاں عام طور پر دیوار سے ذرا آگے کو نکلی ہوئی بنائی جاتی تھیں، جن کے اندر مدخل کا کھانچا (bay) ہوتا تھا، جس کے اوپر ایک بہت بلند آویزہ دار سرکوب (hood) بنا دیا جاتا تھا، جس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے طاق ہوتے تھے؛ مثلاً سلطان بایزید کی مسجد ۹۰۶ھ/ ۱۵۰۰-۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵ء، مسجد سلطان سلیم (لوحہ XXIX ؎ = تصویر ۹) ۹۲۹ھ/ ۱۵۲۲ء اور مسجد شاہزادہ، ۹۵۵ھ/ ۱۵۴۸ء، وغیرہ۔

شمالی افریقہ میں مساجد کے دروازوں کو عام طور پر آگے کو نکلی ہوئی محرابی چھتوں سے (مثلاً مہدیہ میں) نہیں بلکہ ایک پُر تکلّف چھجّے (awning) سے نمایاں کیا جاتا ہے، جو بریکٹوں پر قائم ہوتا ہے اور جس کے اوپر ٹائیلوں کی ڈھلواں چھت ہوتی ہے؛ مثلاً فاس (Fez) میں، دیکھیے H. Teraasse: *La Mosquée des Andalous*، لوحہ عدد ۱۵-۱۷] ہسپانیہ کی مسجدوں میں بھی یہی صورت ہے مثلاً قُرطُبہ کی جامع مسجد]۔

(۲) قلعوں میں:

مسلمانوں کے مستحکم حصاروں کے پھاٹک ابتدائی دَور میں بخطِ مستقیم داخل ہونے کے سیدھے راستے ہوتے تھے، جن کے تحفظ کے لیے فصیل میں [پتھر، پگھلی ہوئی دھات، وغیرہ پھینکنے کے لیے] ایک روزن (machicoulis) اور پہلوؤں میں دو نیم مدوّر بُرج بنا دیے جاتے تھے، مثلاً قصرالحیر الشرقی (لوحہ XXIX ب = تصویر ۱۰)، جسے خلیفہ ہشام نے ۱۱۰ھ/۷۲۹ء میں تعمیر کرایا تھا، کے اندرونی احاطے کا واحد دروازہ اور اسی قلعے کے بیرونی احاطے کے چار دروازے۔

لیکن اُس ابتدائی دَور ہی میں جب خلیفہ المنصور نے ۱۴۵ھ/۷۶۲ء-۱۴۷ھ/۷۶۵ء میں بغداد کا شہر تعمیر کرایا تو قلعوں کے دروازوں میں ایک نئی طرزِ تعمیر یعنی خم دار مدخل نظر آنے لگی۔ یہ طرز بغداد کی بیرونی فصیل کے چار دروازوں میں اختیار کی گئی ہے، جیسا کہ الخطیب کے اِس بیان سے ظاہر ہے: ''جب کوئی شخص خراسانی دروازے کی راہ سے شہر میں داخل ہوتا ہے تو پہلے وہ ایک خِشتی محراب والے لمبوترے دالان (دہلیز آزاج) میں بائیں ہاتھ کو مڑتا ہے۔ اس دالان کی چوڑائی بیس ہاتھ اور لمبائی تیس ہاتھ ہے، اس میں داخل ہونے کا راستہ اس کے عرض میں اور اس سے نکلنے کا راستہ اس کے طول میں واقع ہے، اس سے نکل کر وہ ایک رَحَبہ (صحن) میں پہنچتا ہے، جس کے سِرے پر دوسرا پھاٹک ہے اور یہی پھاٹک شہر کا دروازہ ہے''۔ اس بیان میں صرف ایک موڑ کا ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ داخل ہونے والا پھر ایک صحن میں پہنچ جاتا ہے جس کے دوسرے سرے پر شہر کا بڑا دروازہ بنا ہوا ہے اس لیے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ داخل ہونے والے کا پہلا رُخ باہر جانے کے راستے کے رُخ کے لحاظ سے زاویۂ قائمہ پر ہوگا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مدخل پھاٹک کے برج کے پہلو میں ہوگا۔

اکثر کہا گیا ہے کہ شمالی افریقہ کے بوزنطی قلعوں کے مدخل خم دار ہوتے تھے، لیکن یہ دعوٰی شاید مبالغے پر مبنی نہ ہوگا کہ قیصر جسٹینین (Justinian) کے عہد میں یا اس سے پہلے کی کسی عمارت میں، شمالی افریقہ یا روما، قسطنطینیہ، یا کسی اور جگہ، بوزنطی مملکت میں کہیں بھی، خم دار مدخل کی کوئی مثال ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتی (دیکھیے میرا مقالہ در *Proc. Brit. Academy*، ۳۸: ۱۰۱-۱۰۵)۔ بوزنطی عمارتوں میں اوّلین خم دار مدخل انقیرہ (Ancyra) [انقرہ] کے اندرونی قلعے کا جنوبی دروازہ ہے، جسے ایک کتبے کی رُو سے قیصر مائیکل (Michael) ثالث نے ۸۵۹ء میں تعمیر کرایا تھا۔

قیاس غالب یہ ہے کہ مدخل کی یہ طرز شمال مشرق سے آنے والے عباسیوں کے ہمراہ ماوراء النہر سے آئی ہوگی، جہاں حال ہی میں ٹولسٹوف (Tolstov) کی سرکردگی میں ایک تحقیقی مہم نے زمانۂ قبل از اسلام کے چند حصار دریافت کیے ہیں۔ ان میں سے قدیم ترین حصار جَنبَاس قلعے کا ہے، جو دریائے جیحوں سے پچاس کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک ایسے علاقے میں واقع ہے جہاں اب آب رسانی کا کوئی انتظام نہیں۔ یہ کچّی اینٹوں کا بنا ہوا ایک مستحکم حصار ہے، جس کی پیمائش ۲۰۰x۱۷۰ میٹر ہے۔ اس کی دیواریں اب بھی دس میٹر اونچی ہیں اور مدخل خم دار ہے (دیکھیے Field و Tolstov، در *Ars. Islamica*، ۶: ۱۵۰)۔

خم دار مدخل کے لیے عربی زبان کی اصطلاح 'باشُورہ' ہے۔ یہ بات المقریزی کی اس عبارت سے ظاہر ہے جس میں اس نے قاہرہ کے باب زُوَیلہ کا حال بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ''اُس (یعنی بدرالجمالی) نے باشورہ نہیں بنوایا، جیسا کہ قلعوں کے دروازوں میں رواج ہے۔ اس ترتیبِ تعمیر (باشورہ) میں قلعے میں داخل ہونے کے راستے میں ایک موڑ (عطف) بنایا جاتا تھا، تاکہ محاصرے کے وقت [غنیم کی] فوج کو ہجوم کر کے قلعہ سر کرنے سے روکا جا سکے اور سواروں کی بڑی تعداد کا داخلہ ناممکن بنایا جا سکے'' (الخِطَط، ۲: ۳۸۰، س ۳۵؛ ص ۳۸۱، س ۵)۔

گویا عام طور پر باشُورہ قلعوں کے دروازوں کا لازمی حصّہ ہوتا تھا (جیسا کہ خم دار مدخلوں کی ان مثالوں سے ظاہر ہے جو نیچے مذکور ہیں)، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ پرانے سیدھے مدخل کو خم دار بنانے کے لیے بعد میں کچھ تبدیلیاں کر لی گئی ہوں، مثلاً دمشق کا باب الشرقی۔ یہ عام رومی طرز کا تہرا دروازہ تھا لیکن فان کریمر (von Kremer) (تقریباً ۱۸۵۰ء) نے دیکھا کہ وسطی اور جنوبی دروازے دیوار بنا کر بند کر دیے گئے ہیں اور شمالی دروازے کے آگے کچھ اضافہ (جو مدت ہوئی ہٹایا جا چکا ہے) کر دیا گیا ہے تاکہ لوگ داخل ہوتے وقت زاویۂ قائمہ بناتے ہوئے مڑنے پر مجبور ہو جائیں (*Topographie von Damascus*، ج ۱، نقشہ برص ۱۰)۔ اس سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ المقریزی نے باب النصر اور باب الفتوح (تصویر ۱۱) کی ڈیوڑھیوں میں 'باشورہ' کا جو ذکر کیا ہے اس سے اس کی مراد کیا تھی۔ اگرچہ یہ باشورے پندرھویں صدی مسیحی میں غائب ہو گئے تھے تاہم لازماً یہ اضافی تعمیرات تھیں، جو ''بعد میں'' ان دروازوں کے آگے بنائی گئیں تاکہ ان سیدھے مدخلوں کی کمزوری کو دور کیا جا سکے، جیسا کہ دمشق میں کیا گیا۔ میں نے ''بعد میں'' کا ٹکڑا اس لیے استعمال کیا ہے کہ ان دروازوں میں چونے گچ کا کام پوری طرح محفوظ ہے اور اس میں سے کچھ بھی ٹوٹا اور اکھڑا نہیں۔

علاوہ بریں یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جب کسی جگہ باشورہ کا ذکر آیا ہے (مثلاً بَنیاس کے قریب سُبَیبَہ میں) اور خود مدخل میں ایک نوّے درجے کا خم (عطف) موجود ہے تو یہ فرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس دروازے کے آگے کبھی کوئی عمارت ہوگی۔

لیکن خم دار مدخل کی تعمیر اپنے ظاہری فوائد کے باوجود اس وقت کے بعد عام طور سے رائج نہیں ہوئی؛ چنانچہ خود المنصور نے بھی چند سال بعد رَقّہ کی تعمیر کے وقت اسے اختیار نہیں کیا بلکہ معمار نے محض ترچھے راستے کی طرز اختیار کی (دیکھیے راقم الحروف کی تصنیف *E.M.A.*، ۲: ۳۸-۴۵)۔

بہرکیف دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اُخَیضِر کے مشہور قلعے میں مَدخل کی ایک بڑی زبردست طرز اختیار کی گئی ہے (لوحہ عدد XXXI الف = تصویر ۱۲)۔ داخلے کی محراب، جو تین میٹر چوڑی ہے، دو رُبع مدوّر برجوں کے درمیان ۹۱ سنٹی میٹر پیچھے ہٹا کر بنائی گئی ہے، دونوں طرف ۲۰

سنٹی میٹر چوڑی نالی (groove) ان برجوں کے اندرونی گوشوں کے قریب تک سر بسر اوپر تک چلی گئی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں یقیناً اوپر نیچے ہونے والا دروازہ (portcullis) ہوگا۔ داخلے کی اس محراب سے پیچھے ۹۵ء۱ میٹر کے فاصلے پر ایک اَور محرابی راستہ ہے اور ان دونوں کے درمیان ۳ میٹر چوڑی اور ۹۵ء۱ میٹر گہری ایک غلام گردش ہے، جو سرنگ نما ڈاٹ کی چھت سے پٹی ہوئی ہے۔ اس چھت میں سترہ، سترہ سنٹی میٹر چوڑی تین درزیں ہیں جو دیوار سے دیوار تک چلی گئی ہیں۔ اب فرض کیجیے کہ اُخَیضِر پر حملہ ہونے کو ہے، تو اس دروازے کو اس وقت تک اُوپر اُٹھا ہوا رکھا جائے گا جب تک دشمن کی ایک ٹولی بیرونی محرابی ڈیوڑھی میں اس دروازے کو توڑنے کی غرض سے نہ گُھس آئے جو اندرونی محرابی ڈیوڑھی کے عقب میں واقع ہے۔ اس وقت ان پہرہ داروں کے اشارے پر جو درزوں میں سے جھانک رہے ہوں گے دروازے کو نیچے گرا دیا جائے گا اور اس حملہ آور جماعت پر جو اس طرح مقید ہوگئی ہے اوپر سے اینٹ، پتھر، پگھلا ہوا سیسہ یا ابلتا ہوا تیل پھینکا جائے گا۔ گویا کسی حملہ آور جمعیت کے لیے ناممکن تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح ہلاکت میں ڈالے بغیر دروازے تک پہنچ سکے۔

قاہرہ میں فاطمی عہد کے تین دروازے گیارھویں صدی عیسوی کے بہترین دروازے ہیں، یعنی باب النّصر، باب الفُتُوح (لوحہ عدد XXX = تصویر ۱۱) اور باب الزُّوَیلہ، جو بدر الجمالی نے ۴۸۰ھ/۱۰۸۷ء - ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء میں تعمیر کرائے۔ لیکن یہ دروازے سیدھے ہیں اور ان کے مَدْخل خم دار نہیں۔ ان میں سے ہر ایک دروازے کا پھاٹک پیچھے کو ہٹے ہوئے محرابی کھانچے میں لگایا گیا ہے، جو دو بُرجوں کے درمیان واقع ہے۔ محراب کی پشت پر ایک درز ہے، جس میں سے اوپر کی چھت پر سے دھاوا بولنے والی جماعت پر، جو دروازے پر درکوب (battering ram) سے حملہ کر رہی ہو، اینٹ پتھر وغیرہ گرائے جا سکتے تھے۔

لیکن آئندہ دو سو سال کی صلیبی جنگوں اور اُس وسیع فوجی تجربے کے نتیجے میں جو فریقین نے اس عرصے میں حاصل کیا جلد ہی قلعوں کے مدخل بالعموم خم دار بنائے جانے لگے؛ چنانچہ سلطان صلاح الدّین ایّوبی نے ہمیشہ یہی طریقہ اختیار کیا، مثلاً سینا کے قلعے جِنْدی (تقریباً ۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء) میں، حصارِ قاہرہ کی شمالی فصیل کے تین دروازوں (۵۷۲ھ/۱۱۷۶ء - ۵۷۹ھ/۱۱۸۴ء) میں اور فصیل قاہرہ کے اس حصّے کے دروازوں (تصویر ۱۳) میں جو اس نے تعمیر کرائے (لوحہ عدد XXXI ب)۔ عطفی اور خم دار دروازوں کے فوائد کو اس قدر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا کہ بارھویں صدی عیسوی کے اواخر سے پہلے اس قسم کے دروازے مغرب اقصٰی کے اسلامی ممالک میں بھی تعمیر ہونے لگے، مثلاً مراکش کے شہر رَباط کے قصبۂ اُوْدَایہ کا دروازہ۔

ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی کی تعمیرات میں ایسے دروازوں کی تین مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں: (۱) دریاے فرات پر قلعۂ النَّجْم (۶۰۵ھ/۱۲۰۸ء - ۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء)؛ (۲) بغداد کا باب طِلِّسمان (جو ۱۹۱۸ء میں بارود سے اُڑا دیا گیا تھا)؛ (۳) اور اسی شہر کا باب الوُسطانی.

خم دار دروازے کا اعلیٰ ترین نمونہ قلعہ حلب (لوحہ عدد XXXII = تصویر ۱۴ و ۱۵) کے باب ملک الظاہر میں نظر آتا ہے، جو ابن شدّاد کے قول کے مطابق ۶۱۱ھ/۱۲۱۴ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس دروازے کے راستے میں زاویۂ قائمہ بناتے ہوئے اکٹھے پانچ موڑ بنائے گئے ہیں (لوحہ عدد XXXII = خاکہ ۱).

(K. A. C. CRESWELL)

⊗ **باب:** شیعہ مذہب کے ابتدائی دَور میں امامِ وقت کے سب سے بڑے پیرو مختار کو ''باب'' کہتے تھے، جس کے لفظی معنی ہیں دروازہ۔ اس کا رتبہ امام کے بعد تھا۔ وہ امام سے براہِ راست فیض حاصل کرتا اور اعیانِ دعوت کا سردار ہوتا تھا۔ مؤرّخوں نے المؤید فی الدین الشیرازی کو، جسے اسمٰعیلی ادبیات میں المُستَنْصِر کا باب بتایا گیا ہے، داعی الدُّعاۃ لکھا ہے (ابن مُیَسَّر، ص ۱۰) اور خود المُستَنْصر نے بھی اسے یہی نام دیا ہے (السِجِلّات المُسْتَنْصِرِیّة، طبع عبدالمنعم ماجد، ص ۲۰۰، قاہرہ ۱۹۵۴ء)۔ حُجّت، کا مقام، جو دعوۃ وارشاد کا اہتمام کرتا ہے، 'باب' کے بعد ہے۔ یہ اصطلاح مصر کے فاطمیوں سے پہلے بھی مستعمل تھی، گو یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا ٹھیک ٹھیک مفہوم کیا تھا (دیکھیے W. Ivanow: *The Alleged Founder of Ismailism*، ص ۱۲۵، حاشیہ ۲، بمبئی ۱۹۴۶ء، بحوالۂ الکَشّی: رِجال، ص ۳۲۲؛ وہی مصنّف: *Studies in Early Persian Ismailism*، ص ۱۹ بعد؛ طبع ثانی، بمبئی ۱۹۵۵ء)۔ فاطمی اسمٰعیلیوں کے ہاں 'باب' کے مرتبے اور اس کے فرائض کے متعلق دیکھیے حمِید الدین کرمانی: راحة العقل، طبع محمد کامل حسین و مصطفٰی حلمی، قاہرہ ۱۹۵۳ء، بمدد اشاریہ۔ اَلَموت [رکّ بآن] میں تنظیم دعوۃ کی تفصیل نصیر الدّین طوسی نے دی ہے (تَصوُّرات، طبع W. Ivanow، ص ۹۷؛ دیباچہ، ص XLIII) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں، بابِ باطن' صرف ایک ہی ہوتا تھا، جس کا مرتبہ داعی کے برابر تھا۔ شیعیوں کے فرقۂ نُصَیریہ میں بھی باب کا تصور موجود ہے۔ وہ ہر دور میں باب کا وجود مانتے ہیں۔ اثناعشریوں [رکّ بآن] کی مذہبی تصانیف میں بالعموم ائمۂ کرام کے بابوں کے نام مذکور ہوتے ہیں (آ آ، لائڈن، طبع اوّل، تحت مادّہ نُصَیریہ؛ جعفر بن منصور: کتاب الکَشْف، طبع R. Strothman، ص ۱۴، ۱۹۵۲ء)۔ امام غائب محمدؑ بن حسن عسکری (۲۵۶ھ/۸۷۰ء - ۲۷۵ھ/۸۸۸ء) کے بعد یکے بعد دیگرے چار باب ہوئے۔ یہ ابواب اربعہ اور ہو الاول و الآخر و الظاہر و الباطن کے مظاہر کہلاتے ہیں (نقطة الکاف، ص ۸۶)۔ ان کے نام یہ ہیں: ابو عمر عثمان بن سعید عمری، جس نے سب سے پہلے باب ہونے کا دعوی کیا؛ (۲) مقدم الذکر کا بیٹا ابو جعفر محمد بن عثمان؛ (۳) ابو القاسم الحسین بن روح نوبختی؛ (۴) ابوالحسن علی بن محمد السُمری۔ کہتے ہیں کہ ان میں سے پہلے باب کو خود امام غائبؑ نے نامزد کیا تھا۔ پھر ہر باب بعد کے باب کی نامزدگی کرتا رہا۔ امام غائب کی غَیبت کے بعد سے (جس کے آغاز کا سال مختلف فیہ ہے: ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۷۵ھ

وغیرہ کے سنین بیان ہوے ہیں) سڑسٹھ برس کے عرصے کو، جس میں یکے بعد دیگرے ابواب اربعہ موجود رہے، امام کی غَیبتِ صُغرٰی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ علی بن محمد السُمری (م ۱۵ شعبان ۳۲۸ھ/ ۹۴۰ء) کے بعد امام کی غیبت کُبرٰی کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے، کیونکہ اس مؤخر الذکر باب نے اپنا جانشین نامزد کرنے کے بجاے کہہ دیا تھا کہ اب خود امام غائب کا ظہور ہوگا۔ اس کے بعد باب کا لفظ شیعیوں کے ہاں امام غائب کے سب بڑے پیرو مختار کے لیے استعمال ہونے لگا۔ امام غائب کے لیے دیکھیے وَفَیات الاعیان، ۱: ۴۵۱؛ نور الابصار، ص ۱۶۱؛ نُزھۃ الجَلیس، ۲: ۱۲۸؛ منہاج السنۃ، ۲: ۱۳۱۔

مآخذ: اس کے لیے دیکھیے مآخذ بذیل باب، علی محمد۔

(عبدالمنّان عمر)

⊗ **باب:** علی محمد شیرازی، دور حاضر میں "باب" کے لقب نے علی محمد شیرازی کی وجہ سے زیادہ شہرت پائی۔ اس کا دعوٰی باب ہونے کا تھا۔ یہ شخص شیراز کے ایک تاجر شیعہ گھرانے میں یکم محرم ۱۲۳۶ھ/ ۹ اکتوبر ۱۸۲۰ء کو پیدا ہوا۔ بعض مآخذ میں تاریخ پیدائش یکم محرم ۱۲۳۵ھ/ ۲۰ اکتوبر ۱۸۱۹ء میں بتائی گئی ہے (مقالۂ سیاح، انگریزی ترجمہ از براؤن، تعلیقہ، ص ۲۴۹)۔ والد کا نام محمد رضا اور والدہ کا فاطمہ بیگم تھا۔ گھرانے کا پیشہ بزازی تھا۔ علی محمد ابھی دو سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ماموں آغا سیّد علی نے یتیم بھانجے کی پرورش کی۔ چھے سال کی عمر میں علی محمد کو شیخ عابد کے مکتب قہوۂ اولیا میں بٹھایا گیا، جہاں اس نے پانچ سال تک ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ شیخ عابد شیخ اَحسائی اور کاظم رشتی کا مرید تھا۔ پھر ماموں کے ساتھ اس نے بزازی کا کام شروع کر دیا۔ سترہ سال کی عمر میں اس کے دوسرے ماموں نے اسے اپنے ساتھ اسی کام پر لگا لیا اور تجارتی کاروبار کے لیے بوشہر بھیجا، جہاں وہ پانچ سال تک رہا۔ یہاں پہنچ کر علی محمد ریاضتوں، مراقبوں اور باطنی اشغال میں مصروف ہو گیا، جن کی طرف بچپن ہی سے اس کی توجہ تھی۔ بعض اوقات وہ عین گرمیوں میں گھر کی چھت پر سورج کے سامنے ننگے سر گھنٹوں کھڑا رہتا اور بعض وظائف کیا کرتا تھا (روضات الصفا؛ ناسخ التواریخ؛ *The Dawn-Breakers*، ص ۷۷)۔ ایک دفعہ زیارتِ کربلا کے سفر میں یہ شیخی [رکّ بآن] عقیدے کے رہنما اور شیخ اَحسائی (۱۱۵۷ھ/ ۱۲۴۲ھ) [رکّ بآن] کے خلیفہ کاظم رَشتی (م ۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۳ء) [رکّ بآن] سے ملا اور اس سے تعلیم پانے لگا۔ یہ سلسلہ کوئی دو سال جاری رہا۔ پھر علی محمد شیخ کاظم رشتی کے غالی مریدوں میں شامل ہو گیا۔ بائیس سال کی عمر میں شادی کی (*The Dawn-Breakers*، ص ۷۶)۔ ایک بچہ احمد پیدا ہوا، جو بچپن ہی میں (۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۳ء) فوت ہو گیا۔ باب کی بیوہ ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء تک زندہ رہی (*JRAS*، ۱۸۸۹ء، ص ۹۹۳)۔ باب نے دعوے سے پہلے پوری جائداد ماں اور بیوی کے نام قانوناً منتقل کر دی تھی (*The Dawn-Breakers*، ص ۱۹۱)۔

کاظم رشتی کا خیال تھا کہ امام غائب کے ظہور کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ وفات سے قبل اس نے مریدوں کو ایران میں پھیلا دیا کہ مہدی منتظر کو تلاش کریں۔ اس لیے اس نے کسی کو اپنا جانشین بھی نامزد نہ کیا۔ رشتی کی وفات سے پانچ ماہ بعد اس کا ایک سرفروش مرید مُلّا حسین، جو بُشرُویہ کا رہنے والا اور رشتی کے مکتب میں علی محمد کے ساتھ پڑھ چکا تھا، شیراز پہنچا اور اپنے پرانے ہم مکتب سے ملاقات کی۔ یہی شخص ہے جس نے اس موقع پر علی محمد کو حقّانیت کا "باب" قرار دیا۔ بابی ملا حسین کو "اَوَّلُ مَنْ آمَنَ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ خود علی محمد نے اسے "باب الباب" کا لقب دیا تھا۔

پھر کاظم رشتی کے کچھ مریدوں کو لے کر علی محمد بغرض ریاضت و مراقبہ کوفے کی ایک مسجد میں چلا گیا اور چِلّہ کشی کی۔ ۵ جمادی الاولٰی ۱۲۶۰ھ/ ۲۳ مئی ۱۸۴۴ء کو اس نے "باب" ہونے کا دعوٰی کیا (ناسخ التواریخ)۔ اس وقت اس کی عمر چوبیس سال چار مہینے چار دن تھی۔ کچھ عرصے میں ماننے والوں کی تعداد اٹھارہ نفوس تک پہنچ گئی، جنھیں علی محمد "حروف الحیّ" کہا کرتا تھا۔ یعنی یہ لوگ اس دور میں کتاب زندگی کے بنیادی حروف ہیں۔ حسابِ جمل کے مطابق لفظ "حیّ" کے عدد اٹھارہ ہیں (ح = ۸، ی = ۱۰)۔ خود باب کو ملا کر یہ تعداد انیس ہو جاتی ہے اس مجموعے کا نام باب نے "واحد" اول رکھا، جس کے عدد انیس ہیں (و = ۶، ا = ۱، ح = ۸، د = ۴، کل تعداد ۱۹)۔ انیس کو انیس سے ضرب دیں تو حاصل ضرب تین سو اکسٹھ ہوتا ہے (۱۹x۱۹ = ۳۶۱)۔ اس طرح تین سو اکسٹھ مصدقین کے گروہ کو اس نے 'کُلّ شیئ' کا نام دیا ہے، کیونکہ حساب جُمل کے مطابق کُلّ شیء کے عدد تین سو اکسٹھ ہیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ آگے چلتا ہے۔ جو لوگ حروف "حیّ" کے مصداق تھے ان کے ناموں کی فہرست میں اختلاف ہے۔ براؤن نے لکھا ہے کہ مکمل فہرست مجھے نہیں ملی (مقالۂ سیاح، انگریزی ترجمہ از براؤن، دیباچہ ص XVI)۔ ایک فہرست یہ ہے: ملا حسین بُشرُویہ، ملا محمد حسن، مرزا یحیٰی نوری (صبح ازل)، ملا محمد باقر، ملا علی، ملا حسین، حسین یَزدی، مرزا محمد روضہ خوان یزدی، سعید ہندی، ملا محمود خُوئی، ملا جلیل اُرُومی، ملا احمد مراغی، ملا باقر تبریزی، ملا یوسف اَرْدبیلی، مرزا ہادی قزوینی، مرزا محمد علی قزوینی (طاہرہ کا بہنوئی)، قرۃ العین طاہرہ، محمد علی بارفروشی۔ جیسا بیان ہوا مختلف فہرستوں میں سے کسی میں بھی حسن علی نوری (آئندہ کے بہاء اللہ) کا نام نہیں، جو باب کا مرید تھا اور جس نے بعد میں بہائی مذہب کی بنیاد رکھی؛ حالانکہ اس کے چھوٹے بھائی مرزا یحیٰی نوری کا نام بالکل ابتدائی حصے میں موجود ہے۔ حروف حیّ کو خطاب کرتے ہوے باب نے اپنا نام 'ث' رکھا ہے۔ جسے لفظ 'ثمر' کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔ حروف حیّ کی ایک فہرست کے لیے دیکھیے *The Dawn-Breakers*، ص ۸۰۔

پھر باب نے اپنے ایک نوجوان سرفروش مرید ملا محمد علی بارفروشی (قدوس) کو ساتھ لے کر شوال ۱۲۶۰ھ/ اکتوبر ۱۸۴۴ء میں حج بیت اللہ کے لیے بوشہر سے مکۂ مکرمہ کا سفر کیا۔ تجویز یہ تھی کہ کسی روایت کو پورا کیا جائے جس میں لکھا تھا کہ یہ

مدّعی مکۂ مکرمہ سے اپنے دعوے کا آغاز کرے گا۔ اس موقع پر یہ تجویز بھی کی گئی کہ اسلامی ممالک میں داعی بھجوائے جائیں تاکہ اس سفر کے بعد لوگ ایک خاص دن کوفے میں جمع ہو جائیں۔ اس سلسلے میں باب نے متعدّد خطوط بھی لکھے۔ بابی مصنّف جانی کاشانی کی ایک عبارت بھی اس کے بعض حصّوں پر روشنی ڈالتی ہے لیکن خلاف امید لوگوں نے اس دعوت پر لبیک نہ کہی۔ لوگ کوفے میں جمع نہ ہوے اور منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا (نقطة الکاف، ص ۱۱۱)۔ باب دو ماہ کے بعد جدّے پہنچا۔ دورانِ قیام حرم میں اس نے صحیفة بین الحرمین کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی، جس میں اپنی دعوت کا خلاصہ پیش کیا۔ یکم محرم ۱۲۶۱ھ/ ۱۰ جنوری ۱۸۴۵ء کو وہ مکے سے مدینے روانہ ہوا تھا.

باب کے داعی ملک میں گھوم رہے تھے اور ان کی جدوجہد پر حکومت کی (جسے لارڈ کرزن نے چرچ سٹیٹ (Church State) کا نام دیا ہے) نظر تھی۔ خاص تاریخ کو ملک کے طول وعرض سے لوگوں کے جمع کرنے کی تحریک حکومت نے بھی تشویش کی نظر سے دیکھی۔ آخر ایک موقع پر جب باب کے ماننے والوں نے جسارت کی کہ شیراز میں اذان دیتے وقت یہ کلمہ بڑھا دیا کہ ''میں اقرار کرتا ہوں کہ علی، نبیل (یعنی علی محمد باب) سے پہلے آئینہ انفاس خداوندی ہے'' تو عوام بھی مشتعل ہوگئے۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ باب کی تحریروں میں بعض ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو ان کے نزدیک درست نہ تھیں۔ آخر ۲ شعبان ۱۲۶۱ھ/ ۶ اگست ۱۸۴۵ء کو ملا صادق، مرزا محمد علی بارفروشی اور ملا علی اکبر اردستانی وغیرہ بعض بابیوں کو گرفتار کر کے شیراز کے گورنر نظام الدولہ مرزا حسین خان آجودان باشی کے سامنے پیش کیا گیا، جس نے انھیں کچھ بدنی سزا دے کر شہر بدر کر دیا، اس وقت خود باب حج بیت اللہ کے بعد بوشہر واپس آچکا تھا۔ حکومت نے اس پر بھی بعض پابندیاں لگا دیں اور خط وکتابت سے روک دیا۔ لیکن باب نے در پردہ (''درنہایت خفا'') اپنی کوششیں جاری رکھیں (نقطة الکاف، ص ۱۱۲)۔ آخر ۱۹ رمضان ۱۲۶۱ھ/ ۲۱ ستمبر ۱۸۴۵ء کو وہ گرفتار ہو کر شیراز پہنچا، جہاں تادیب کے بعد اسے اس کے ماموں سید علی کی ضمانت پر صرف نظر بند کر دیا گیا اور حکم دیا کہ باہر کے لوگوں سے میل ملاقات نہ رکھی جائے۔ پھر اس نے محتاط روش اختیار کر لی اور کہا کہ میرا دعوٰی باب ہونے کا نہیں۔ شیراز کی مسجد وکیل میں بھی ایسا ہی اعلان کر دیا گیا اور اس طرح وہ خاموش بیٹھ گیا۔ شیراز میں اس نظر بندی سے باب کو اصفہان کے بعض آدمیوں نے نکالا اور اسے اصفہان لے گئے۔ یہ سرفروش حسین اردستانی اور کاظم زنجانی تھے۔ تاریخ جدید میں اس سفر کے مفصّل حالات ملتے ہیں، نیز دیکھیے نقطة الکاف، ص ۱۱۳ ببعد۔ باب کو اصفہان پہنچے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ اسے واپسی کے احکام دیے گئے۔ آخر ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء میں وہ دوبارہ گرفتار ہوا اور حکم دے دیا گیا کہ اسے آذربیجان کے کوہستانی قلعہ ماکو میں قید کر دیا جائے جہاں پہنچنا دشوار تھا۔ باب نے تبریز میں رکھنے کی جو استدعا بار بار کی وہ حکومت نے ٹھکرا دی۔ ماہ کو کے سفر میں اس کے ہمراہ ملا شیخ علی (جناب عظیم) اور ملا محمد (معلم نوری) تھے۔ علاوہ ازیں میرزا عبدالوہاب، ملا محمد، سید حسین یزدی اس کا بھائی سید حسن یزدی اور سید مرتضٰی بھی اپنے طور پر ساتھ ساتھ ماہ کو پہنچے، بعد میں متعدد اَور بابی بھی جاتے آتے رہے۔ سرکاری حکم یہ تھا کہ باب کو خط وکتابت کی اجازت نہیں لیکن خفیہ طور پر یہ خط وکتابت جاری رہی۔ ربیع الآخر ۱۲۶۴ھ/ مارچ ۱۸۴۷ء سے رمضان ۱۲۶۶ھ/ جولائی ۱۸۵۰ء تک باب ماہ کو میں رہا اور یہیں اس نے بیان (فارسی)، اور دلائل السبعه وغیرہ کتابیں تالیف کیں.

بابی سربراہوں نے بہاءاللہ کے ایما سے رجب ۱۲۶۴ھ/ جون ۱۸۴۸ء کو بمقام بدَشت ایک 'کن ونشن' منعقد کی۔ اسے ''شاہ رود کانفرنس'' بھی کہتے ہیں۔ اس میں اکاون عمائد شامل ہوے۔ یہ سب بہاءاللہ کے مہمان تھے اور ان سب کے نام باب نے علٰیحدہ علٰیحدہ پیغام بھیجے تھے۔ اسی موقع پر باب کی طرف سے حسین علی نوری کو بہاء، قرة العین کو طاہرہ اور محمد علی بارفروشی کو قدوس کے القاب دیے گئے۔ خود بہاءاللہ بدشت میں بائیس دن رہا۔ مقصد یہ تھا کہ باب کو ماہ کو سے چھڑانے کا بندوبست کیا جائے۔ اس میں ملا حسین (باب الباب)، ملا محمد علی (قدوس، اسم اللہ الآخر، نقطۂ آخری)، قرة العین طاہرہ بھی شریک تھے۔ باب کو آزاد کرانے کے سلسلے میں طے ہوا کہ اصل سزا کے خلاف شاہ ایران سے احتجاج کرنے کے علاوہ بابی حضرات بکثرت ماہ کو میں جمع ہو جائیں اور طاقت کے بل پر باب کو چھڑا لیا جائے۔ بدشت میں اس اجتماع کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ باب کے مذہب کے استقلال کا اعلان کیا جائے۔ اس اثنا میں ملا حسین بَشْرُویہ خفیہ طور پر باب سے ماہ کو میں ملا اور بعض منصوبے تیار کیے۔ اس کانفرنس میں محمد علی بارفروشی مشہد سے آکر زرّیں تاج قرة العین طاہرہ بنت ملا صالح قزوینی سے ملا اور میرزا جانی کاشانی کے الفاظ میں شمس وقمر کا قران ہوا (نقطة الکاف، ص ۴۴۴).

بدشت کانفرنس کے بعد جناب قدوس اور قرة العین نے مازندران کی طرف ایک ہی ہودے میں سفر کیا جو ان کے لیے خود بہاءاللہ نے تیار کروایا تھا۔ اس یک جائی سفر میں قرة العین ہر روز ایک غزل لکھ کر حدی خوانوں کو دیتی تھی جو راستے میں اسے گاتے جاتے تھے (The Dawn-Breakers، ص ۲۹۸، ۸۴: نقطة الکاف، ص ۱۵۱)۔ بدشت کانفرنس کی کارروائی سے جب حکومت مطلع ہوئی تو اس نے باب کو ماہ کو جیل سے بھی نہایت دور افتادہ چہریق جیل میں منتقل کر دیا۔ وہاں جاتے ہوے باب کو چند روز تبریز میں بھی ٹھیرایا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر اس نے اپنے دعوے سے توبہ کر لی۔ اس کی تائید میں پروفیسر براؤن نے دو دستاویزیں بھی پیش کی ہیں (Materials for the study of the Babi Religion، ص ۲۵۷)۔ بابی مؤرّخوں نے اس واقعے سے انکار نہیں کیا۔ بلکہ تقیہ [رَک بآن] کے پردے میں پناہ لی ہے۔ خود بابی مؤرخ مرزا جانی کاشانی کا بیان ہے کہ باب نے قتل ہونے سے ایک رات پہلے مریدوں کو تقیّے کی تلقین کی بلکہ یہاں تک کہا کہ ''کل جب میری بابت تم سے پوچھا جائے تو تقیّے سے کام لینا، میرا انکار کر دینا بلکہ (مجھ پر) لعنت بھیجنا کہ یہی تمھیں اللہ تعالٰی کا حکم ہے (نقطة الکاف،

ص ۲۴۷)۔ (جناب قدوس) محمد علی بارفروشی کا درجہ بابیوں میں بانیِ مذہب کے بعد غالباً سب سے بڑا ہے۔ طبرسی کی بغاوت (دیکھیے سطور آئندہ) کے بعد جب جناب قدوس کو ولی عہد کے سامنے پیش کیا گیا اور اسباب بغاوت دریافت کیے گئے تو اس نے بغاوت کی ساری ذمے داری ملا حسین بشرُویہ پر ڈالنے کی کوشش کی بلکہ اس پر لعنت بھی بھیجی۔ اس بارے میں مرزا جانی کاشانی کہتا ہے کہ یہ جواب فتنے سے بچنے کے لیے دیا گیا تھا (نقطة الکاف، ص ۱۹۲، نیز دیکھیے *The Dawn-Breakers*، ص ۱۷۶)۔ چہریق جیل میں باب کے لیے قید و بند کی صعوبتیں ماہ کو سے زیادہ تکلیف دہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ باب نے ماہ کو جیل کے لیے ''باسط'' اور چہریق کے لیے لفظ ''شدید'' استعمال کیا ہے (*The Dawn-Breakers*، ص ۲۴۳)، اور یہاں کے پہرے داروں کو سید حسین یزدی نے ''غِلاظ شِداد'' کہا ہے۔ تاہم یہاں بھی باب کا اپنے مریدوں سے خفیہ طریق سے سلسلۂ رسل و رسائل جاری رہا۔ باب نے ماہ کو اور چہریق میں کوئی تین سال بسر کیے۔ بدشت کانفرنس کے بعد ایران کے مختلف حصّوں میں زبردست فسادات رونما ہو گئے۔

نیالا مقام پر بہاء اللہ کے علاوہ قرۃ العین اور ایک شیرازی نوجوان مرزا عبداللہ رہ گئے۔ بہاء اللہ نے قرۃ العین کو اس کے سپرد کیا اور اس طرح تینوں بہاء اللہ کے گاؤں نور چلے گئے (*The Dawn-Breakers*، ص ۲۹۹)۔ بارفروش پہنچ کر محمد علی نے اپنے گرد بابیوں کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ دور دراز تک داعی بھیجے گئے۔ ملا حسین بھی خراسان سے مازندران کی طرف بڑھا۔ دوران سفر میں اس کے مسلّح ساتھیوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ اس کے ساتھی بڑے پرجوش اور سرفروش تھے (*The Dawn-Breakers*، ص ۱۶۰)۔ جب اسے محمد شاہ بادشاہ ایران کی وفات کی خبر ملی تو اس نے اپنے ہمراہیوں سے کہا: مجھے اس خبر کا انتظار تھا (نقطة الکاف، ص ۱۵۵)۔ یہ الفاظ بڑے معنی خیز ہیں۔ بہرحال اب اس کے ہمراہیوں کی تعداد دو سو تیس ہو چکی تھی لیکن راستے ہی میں ایک موقع پر تیس آدمی اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ بقیہ آدمیوں کو لے کر وہ بارفروش پہنچ گیا۔ شہریوں کے ساتھ اس کی جھڑپ ہوئی (نقطة الکاف، ص ۱۵۰) اور اس طرح یہ مسلّح گروہ شہر میں داخل ہو گیا۔ ملا حسین جب اپنے دستوں کو لے کر شیخ طبرسی کے اجتماع میں شرکت کے لیے اصفہان پہنچا تو اسے خود احساس تھا کہ اتنے لوگوں کے ساتھ شہر میں داخل ہونے سے لوگوں کو شُبہہ ہو گا اس نے انھیں مختلف راستوں سے شہر میں داخل کیا (*The Dawn- Breakers*، ص ۱۶۰)۔

جب ان کی تعداد تین سو تک پہنچ گئی تو حکومت کے ایک دستے کے ساتھ ان کی جھڑپ ہو گئی تیرہ بابی مارے گئے۔ آخر دو ہزار بابیوں کی جماعت شیخ طبرسی کے مزار کو مرکز بنا کر حلقہ گیر ہو گئی۔ بہت سا اسلحہ جمع کیا، خندقیں کھود لیں اور حملہ و حفاظت کے وسیع انتظامات کیے، جن کی اجمالی تفصیل صاحب ناسخ التواریخ نے دی ہے۔ ملا حسین نے لوگوں کو یقین دلایا کہ اگلے سال دنیا میں باب کی حکومت ہو گی۔ اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو امام ثامن کا مظہر قرار دیا، کسی کا نام امام رضا رکھا، کسی کو سید سجّاد کہا۔ ان ایام میں بابیوں نے رسد کی فراہمی کے لیے گرد و نواح کی آبادیوں کو لوٹا اور جب کوئی گاؤں ان کے مطالبات پورے نہیں کرتا تھا تو اس کے مکانات کو آگ لگا دیتے تھے (نقطة الکاف، ص ۱۶۱؛ *Materials for the study of the Babi Religion*، ص ۲۴۱)۔ اس زمانے میں بابیوں نے عوام پر جو ظلم توڑے ان کا ذکر صاحب ناسخ التواریخ نے کیا ہے۔ آخر شاہ ایران نے شہزادہ مہدی قلی مرزا کو چند فوجی دستے دے کر قلعۂ شیخ طبرسی کی مہم پر بھیجا۔ طرفین میں جنگ ہوئی اور یہ معرکے اوائل ذوالقعدہ ۱۲۶۴ھ سے اواخر جمادی الاُخریٰ ۱۲۶۵ھ تک جاری رہے۔ ان میں ملا حسین بشرویہ مارا گیا۔ حکومت کی فوج کے متعدد افراد بھی جان بحق ہوے، جن میں جعفر قلی خان اور طہماسپ قلی خان وغیرہ بھی شامل تھے۔ آخر بابیوں کی رسد ختم ہو گئی اور محمد علی بارفروشی کے وعدے اور اس کی دلائی ہوئی امیدیں بھی پیہم ٹوٹتی چلی جا رہی تھیں۔ اس موقع پر صاحب ناسخ التواریخ کے الفاظ یہ ہیں: ''نیز چوں ہر خبر کہ حاجی محمد علی آوردہ بود بکذب و دروغ برآمد عقیدتِ اصحابِ او را فتوری پدید شد''۔ ان کے ڈیڑھ ہزار سے اوپر افراد کام آ چکے تھے۔ آخر بابیوں کو شکست ہوئی اور محمد علی بارفروشی نے اپنے دو سو سے کچھ اوپر ہمراہیوں کے ساتھ ہتھیار ڈال دیے۔ محمد علی بارفروشی کو قتل کر کے اس کی لاش جلا دی گئی (نقطة الکاف، ص ۱۹۸، قلعۂ طبرسی کے کچھ بابیوں کے اسما اور حالات کے لیے دیکھیے *The Dawn-Breakers*، ص ۴۱۴ ببعد)۔ قلعۂ شیخ طبرسی میں بابیوں کے فوجی اجتماع میں ایران ہی کے مختلف حصوں کے بابی جمع نہیں ہوے تھے بلکہ عراق، ہندوستان اور ترکی سے بھی لوگ آئے تھے اور اختتام جنگ کے بعد بھی اسلحۂ جنگ کا خاصہ ذخیرہ قلعے سے دستیاب ہوا تھا۔ دریں اثنا دارالحکومت میں بھی ان کی کوششیں جاری تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح بابیوں کی تنظیم کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور یہ اجتماع ایک سوچی سمجھی تدبیر کے ماتحت تھا اور مقصد یہ تھا کہ قلبِ ایران میں بابی حکومت قائم کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اقدام کے لیے وہ وقت منتخب کیا گیا جب بادشاہ ایران کا انتقال ہوا اور بظاہر حکومت کی گرفت ڈھیلی ہونے کا امکان تھا (*The Bāby Movement*، ص ۱۵)، خود باب نے قلعۂ شیخ طبرسی میں قدوس کو کمک بھجوائی اور اپنے تمام مریدوں کو حکم دیا کہ وہاں پہنچیں (*The Dawn-Breakers*، ص ۳۱)۔ ایک شورش ملا محمد علی زنجانی نے برپا کی (یہ محمد علی، حضرت حجت' کے لقب سے مشہور ہے)۔ اس نے قلعۂ علی مردان خان میں ہزاروں فوجی مع عسکری ساز و سامان جمع کر لیے۔ اس طرح بابیوں کی ایک فوج اکھٹّی ہو گئی۔ بہت سے ساتھیوں کو مختلف عہدے تفویض کیے؛ مثلاً احمد زنجانی کو اپنا نائب مقرر کیا، عبداللہ خباز کو حکومت مصر کا وعدہ دیا۔ اس نے حکومت کے دیوانی احکام کی خلاف ورزی شروع کر کے اس سے جھڑپوں کا آغاز بھی کر دیا اور توپ و تفنگ کے منہ کھل گئے۔ بابیوں نے زنجان کے بازار کو آگ لگا

دی (ناسخ التواریخ درذکر فتنۂ جماعت بابیہ درزنجان) آخر بادشاہ نے بیگلر بیگی [رکّ بآن] محمد خان میر پنجہ کواس شورش کی سرکوبی کے لیے بھجوایا۔ ملامحمد علی مازندرانی اوراس کے ساتھیوں نے اس کا بھی مقابلہ کیا اور جو مخالف بھی ان کے ہاتھ لگا اسے عبرتناک سزائیں دیں۔ تپتے ہوے لوہے سے انھیں داغا اور قینچی سے ان کی جلد کو کاٹ کاٹ کر نذر آتش کر دیا (ناسخ التواریخ، درذکر فتنۂ بابیاں درزنجان)۔ آخر حکومت کو اَور کمک بھیجنی پڑی۔ اب محمد علی کا حملہ بھی کمزور پڑ گیا۔ اس کے بعض ساتھی مثلاً نجف قلی بن حاجی کاظم آہن گر، حیدر بقال جو بڑا شاہ زور مشہور تھا، اور میر سیارہ فتح علی شکارچی اس سے علٰیحدہ ہوگئے، کچھ مارے گئے اور محمد علی بھی ایک زخم کی تاب نہ لاکر جان بحق ہوگیا۔ آخر اس کے وزیر سلیمان بزاز نے اپنے ساتھیوں کے مشورے سے ہتھیار ڈال دیے۔

غرض اس طرح ایران کے مختلف حصّوں میں زبردست فسادات رونما ہوتے رہے۔ خود تہران نے بھی اپنے بہادر جو شُہداے سبعۂ تہران، (دیکھیے *The Dawn-Breakers*، ص ۴۳۰ ببعد) کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں پیش کر دیے، یعنی ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء میں وزیر اعلٰی کے قتل کی سازش میں سات بابیوں کو تہران میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان میں باب کا ماموں سید علی بھی تھا۔ باقیوں کے نام یہ ہیں: ملّا اسمٰعیل قُمّی، مرزا قربان علی درویش، سید حسین تُرشیزی مجتہد، ملّا نقی کرمانی، ملّا محمد حسین تبریزی اور ملّا صادق مراغی۔ دراصل اس موقع پر اڑتیس باب گرفتار ہوے تھے لیکن مندرجۂ بالا سات کے سوا باقیوں نے معافی مانگ کر رہائی پائی۔

اب بابیوں کی سرگرمیاں حکومت اور عوام دونوں کی نظر میں روز بروز زیادہ سے زیادہ مخدوش ہوتی جارہی تھیں اور وقت آ چکا تھا کہ حکومت اس تحریک کے سرگروہ کی طرف زیادہ توجہ کرتی؛ چنانچہ امیر نظام میرزا تقی خاں کی تحریک سے باب کو قلعۂ چہریق سے تبریز لاکر ایک جرگے کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس جرگے کی صدارت خود بادشاہ نے کی اور ولی عہد ناصر الدین بھی وہاں موجود تھا۔ اس جرگے کی کارروائی کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: روضات الصفاء، قصص العلماء، اور ناسخ التواریخ۔ بابی روایات میں اس موقع کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ اس جرگے نے باب کو بیدزنی کی سزا دے کر دوبارہ قلعۂ چہریق میں بھجوا دیا۔ صاحب ناسخ التواریخ بتاتا ہے کہ اس موقع پر باب سے متعدد علمی سوالات کیے گئے لیکن وہ ان کا جواب نہ دے سکا۔ تبریز میں باب نے ملّا محمد مامقانی کے سامنے بھی اپنے عقائد چھپانے کی کوشش کی اور بہت کچھ عجز وانکسار سے کام لیا لیکن مامقانی نے کوئی نرمی نہ دکھائی بلکہ یہ کہا: اَلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ مِنْ قَبْلُ (ناسخ التواریخ، درباب قتل میرزا علی محمد باب)۔ بابی شورشیں اب بھی کم نہ ہورہی تھیں۔ آخر باب کو دوبارہ تبریز لایا گیا، یہاں اسے اس کے دو مریدوں — ملّا محمد علی یزدی اور آغا سید حسین — سمیت گولی سے اڑا دینے کی سزا تجویز ہوئی۔ جب ان تینوں مجرموں کا جلوس تبریز کے بازاروں سے گزر رہا تھا اور لوگ انھیں گالیاں دے رہے تھے اور مار پیٹ رہے تھے تو آغا سید حسین نے بابی عقیدے سے توبہ کرلی۔ چنانچہ اسے رہا کر دیا گیا اور

باب اور ملّا محمد علی یزدی کو تبریز چھاونی کے ایک چوراہے میں پانچویں جیش کی ایک عیسائی پلٹن نے اتوار کے دن ۲۸ شعبان ۱۲۶۶ھ/۹ جولائی ۱۸۵۰ء کو دوپہر کے وقت قتل کر دیا۔ گولیوں سے چھدی ہوئی لاش چند دن تک لوگ کوچہ و بازار میں گھسیٹتے پھرے اور آخر جانوروں کا طعمہ بننے کے لیے شہر کے باہر پھینک دی گئی۔ عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ اسے درندے کھا گئے (مقالۂ سیاح، ص ۵۷) لیکن بابی روایت یہ ہے کہ باب کے مرید آدھی رات کو خفیہ طور پر لاش وہاں سے اٹھا کر لے گئے (*The Dawn-Breakers*، ص ۵۱۹) اور پچاس برس تک اسے مخفی رکھتے رہے۔ آخر عبدالبہاء کے وقت ایک لاش ایران سے فلسطین لائی گئی، جسے کوہ کرمل پر ایک جگہ دفن کیا گیا۔ اب وہاں ایک قبر موجود ہے جسے باب کی قبر قرار دیا جاتا ہے اور اسے مقام اعلٰی کہا جاتا ہے۔ مزید دیکھیے محمد علی فیضی: ملکہ کرمل۔ باب کو قتل کی سزا دینے سے پہلے حکومت نے ڈاکٹر Cormeck کی سرکردگی میں تین ڈاکٹروں (باقی دو ایرانی تھے) کا ایک کمیشن مقرر کیا کہ وہ باب کا طبی معائنہ کرنے کے بعد بتائیں کہ باب دماغی لحاظ سے معذور تو نہیں۔ ان کی رپورٹ کے بعد حکومت نے یہ قدم اٹھایا (*Materials for the study of Babi Religion*)۔ جس صبح کو باب گولیوں کا نشانہ بنایا گیا اس رات اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ وہ اسے خود ہی قتل کر دیں (نقطۃ الکاف، ص ۲۴۶؛ *The Dawn-Breakers*، ص ۵۰۸)۔ قتل سے پہلے باب نے اپنے ساتھیوں کو جو وصیت کی تھی اسے میرزا جانی کاشانی نے محفوظ رکھا ہے۔ اس نے کہا: 'دوستو! کل جب تم سے میرے بارے میں استفسار کیا جائے تو تقیّے سے کام لینا، میرا انکار کر دینا، بلکہ (مجھ پر) لعنت بھیجنا، کیونکہ اللہ تعالٰی کا تمھیں یہی حکم ہے (نقطۃ الکاف، ص ۲۴۷؛ *The Dawn-Breakers*، ص ۵۰۸)۔ مرتے وقت باب ابھی اکتیس سال اور کوئی آٹھ ماہ کا تھا اور اس نے چھے سال تک ایران کی سیاسی فضا کو مکدر رکھا۔ باب عین اس وقت جب کہ وہ اپنے مذہب کی داغ بیل ڈال رہا تھا قتل ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مذہب زیادہ نہ پھیل سکا اور نہ اس کی جدوجہد کی آئندہ راہیں روشن ہو سکیں، نہ اس کے ماننے والوں کے لیے کوئی معین دستور مکمل ہو سکا۔ اس کے متّبعین کا سب سے قیمتی سرمایہ اپنے پیشوا کی محبت تھی۔ اس کی ناکامی کی ایک وجہ یہ تھی کہ آغاز کار ہی میں حکومت سے اس کا ٹکراؤ ہوگیا۔ تیسری وجہ یہ کہ اس کے بعد اس کے ماننے والے دو ٹکڑوں میں بٹ گئے اور اکثریت والے گروہ نے بہائی مذہب کو مستقل رنگ دے دیا۔ اس کے بعد سے بابی مذہب کی تاریخ بہائیت اور ازلیت میں بٹ جاتی ہے۔

مآخذ: ان کتب کے علاوہ جن کا ذکر متن میں ہو چکا ہے دیکھیے: مآخذ مقالۂ باب؛ باب، علی محمد؛ بہاء اللہ؛ بہائیت؛ احمد احسائی؛ قرۃ العین۔

(عبدالمنان عمر)

بابُ الابواب: یعنی دروازوں کا دروازہ، قدیم متون میں الباب ✱

والا بواب یعنی دروازہ اور دروازے اور اکثر محض الباب، یہ ایک درّے اور قلعے کا عربی نام ہے جو کوہ قفقاز کے مشرقی سرے پر واقع ہے، فارسی میں در بند، بعد میں ترکی اثر کے تحت اس کا نام [دمیر قپو] (= آہنیں دروازہ) ہو گیا۔ یہ ''دروازے'' گویا مشرقی کوہ قاف کی وادیوں کے دہانے ہیں (ابن خُرّ داذبہ، ص ۱۲۳-۱۲۴، قب یاقوت، ۱:۴۳۹)۔ ان میں الباب جو بڑے درّے میں ہے سب سے زیادہ اہم ہے۔ شروع میں اسے شمالی حملہ آوروں کے خلاف کسی زمانے میں مستحکم کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں انوشروان نے پہاڑوں سے سمندر تک سات فرسخ [تقریباً پچیس میل] لمبی ایک دیوار تعمیر کرائی تھی (القزوینی: *Cosmography*، ص ۳۴۱)۔ ان استحکامات کے موجودہ آثار در بند سے قرہ سُرت تک جاتے ہیں۔

جب ۲۲ھ/ ۶۴۳ء میں مسلمان پہلے پہلے در بند پہنچے تو یہاں ایک ایرانی قلعہ نشین فوج قابض تھی لیکن ایسا کوئی بیان موجود نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ اس زمانے میں اس مقام کی ہیئت کیا تھی۔ اس کے بعد کے بیس سال میں جو جنگیں عربوں اور خزروں کے درمیان (جنھیں اس وقت قفقاز کے شمال میں سب سے زیادہ اقتدار حاصل تھا) ہوئیں ان کے ضمن میں باب الابواب کا ذکر اکثر آتا ہے اور اسی طرح بعد کی صدی میں بھی۔ ۱۱۳ھ/ ۷۳۱ء میں مَسْلَمہ بن عبد الملک خزر یہ سے واپس ہو جانے کے دوران میں الباب کے قریب اس حالت میں پہنچا کہ اس کے سپاہی [خستگی و درماندگی سے] جان بلب تھے۔ ۱۱۹ھ/ ۷۳۷ء میں مروان بن محمد (بعد ازاں خلیفہ مروان ثانی) نے خزروں پر باب الابواب اور باب اللّان (Darial) [رک بآں] سے بیک وقت حملہ کیا اور کچھ مدت دریائے والگا تک تمام علاقے پر قابض رہا۔ آہستہ آہستہ خزروں کا کوئی خطرہ نہ رہا۔ باب الابواب کے راستے اسلامی ممالک پر ان کا آخری بڑا حملہ ۱۸۳ھ/ ۷۹۹ء میں ہوا تھا۔

الاِصْطَخْری (تخمیناً ۳۴۰ھ/ ۹۵۱ء) نے باب الابواب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بحیرۂ خزر سے آنے والے جہازوں کے لیے شہر کے اندر ایک بندرگاہ تھی۔ دونوں سمندری دیواروں کے درمیان اس بندرگاہ کا ترچھا راستہ بہت تنگ تھا اور مزید حفاظت کے لیے اس میں ایک زنجیر یا تیرتی ہوئی چوبی روک (boom) لگی ہوئی تھی۔ یہ [دفاعی] انتظامات، مذکورۂ بالا دیوار اور فصیل شہر کی مانند، بلاشُبہہ ساسانی عہد کے ہوں گے، لیکن ان کی درستی و اصلاح وغیرہ عربوں کی رہین منّت ہے، مثلاً مشہور و معروف وزیر علی بن الفرات (۲۹۶ھ/ ۹۰۸ء کے بعد) کی (ہلال الصّابی: کتاب الوزراء، طبع Amedroz، ص ۲۱۷-۲۱۸)۔ الاِصْطَخْری یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کے زمانے میں باب الابواب بحیرۂ خزر کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی اور آذربیجان کے دارالحکومت اردبیل سے بھی بڑی تھی۔ یہاں سے کتان (linen) کے ملبوسات، جو اس علاقے میں عملاً صرف یہیں بنتے تھے، غیر ملکوں کو بھیجے جاتے تھے۔ علاوہ بریں زعفران اور غیر مسلم شمالی علاقوں کے غلام بھی برآمد کیے جاتے تھے۔ المسعودی کہتا ہے کہ بُرطاس سے، جو دریائے والگا پر واقع ہے، سیاہ لومڑی کی کھالیں یہاں درآمد ہوتی تھیں۔ یہ کھالیں دنیا بھر میں مشہور تھیں (التنبیہ والاشراف، ص ۶۳)۔ المسعودی کے نزدیک باوجود ان ابتدائی کوششوں کے جو یہاں عربوں کو آباد کرنے کے لیے کی گئیں (قب البلعمی، طبع Dorn، ص ۵۳۸) اور باوجود باب الابواب اپنے [عربی] نام کے صریحاً کوئی عرب شہر نہ تھا۔

زمانۂ حال کی تحقیقات سے یہ پتا چلا ہے کہ یہاں چوتھی/دسویں صدی میں ایک شاہی خاندان بنو ہاشم کے نام سے موجود تھا، جن کے اپنے ہمسایہ شروان شاہیوں سے مراسم و تعلّقات تھے (حُدود العالم، ص ۴۱۱)۔ ان بنو ہاشم کے متعلق سب سے بڑا ماخذ گیارھویں صدی کے ایک گم نام مصنّف کی کتاب تاریخ الباب ہے، جس کا حوالہ احمد بن لُطف اللہ منجّم باشی (سترھویں صدی) نے اپنی تصنیف جامع الدُّوَل میں دیا ہے۔ اس ماخذ سے روسیوں کی نقل و حرکت کے بارے میں ہماری معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوتا ہے، مثلاً اس میں یہ ذکر ہے کہ ۴۲۳ھ/ ۱۰۳۲ء میں الباب کے غازیوں نے روسی حملہ آوروں کے ایک گروہ کو قفقاز کے ایک تنگ درے میں گھیر کر تباہ کر دیا تھا (منورسکی (Minorsky): *Studies in Caucasian History*، ص ۷۷)۔

ترکوں کو جو غلبہ و اقتدار الباب اور عام طور پر آس پاس کے علاقے میں حاصل ہوا وہ عہد سلجوقی سے شروع ہوتا ہے (قب احمد زکی ولیدی طوغان: عمومی ترک تاریخنہ گیریش، ۱:۱۹۰، ۴۱۱)۔ مغلوں کے عہد میں الباب کا ذکر قفقاز کی جانب شمالی علاقوں پر سُبُوتائی کی یلغار (۱۲۲۲ء) کے ضمن میں آتا ہے۔ تیمور اور جِبہ (Jebe) دونوں نے کئی بار اس علاقے کے قرب و جوار میں تاخت و تاراج کی۔ مغل عہد کا عام اثر یہ ہوا کہ سابقہ خلافت کے شمال مغربی صوبوں میں ترکیت کو تقویت و استحکام حاصل ہو گیا۔

باب الابواب کے مفصل ترین حالات القزوینی (۶۷۴ھ/ ۱۲۷۵ء) نے لکھے ہیں۔ وہ اسے ایک بارونق اور خوش حال اسلامی شہر بتاتا ہے، جس کے مکان پتھر کے بنے ہوئے ہیں اور فصیل سے بحیرۂ خزر کا پانی ٹکراتا ہے۔ اس کی لمبائی کوئی دو تہائی فرسخ کے قریب ہے اور عرض ایک ''تیر پرتاپ'' کے برابر۔ فصیل شہر پر برج بنے ہوئے تھے، جن میں سے ہر ایک میں ایک مسجد تھی، جو آس پاس کے لوگوں اور اہل علم کے فائدے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ فصیل پر ہمیشہ پہرہ رہتا تھا اور شمال کی جانب سے کسی اچانک حملے کے اندیشے سے پہاڑ کی ایک قریبی چوٹی پر آگ روشن رہتی تھی۔ القزوینی ان طلسمات کا بھی ذکر کرتا ہے جو ترکوں کے حملے کو روکنے کے لیے نصب کیے گئے تھے اور غالباً زمانۂ قبل از اسلام کی سنگ تراشی کے باقیات تھے۔ وہ ایک باؤلی کا بھی ذکر کرتا ہے جو شہر کے باہر واقع تھی اور جس میں سطح آب تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ شہر کے باہر ایک مسجد بھی تھی جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اس میں مَسْلَمہ بن عبد الملک کی تلوار رکھی ہوئی تھی۔

جس وقت القزوینی نے یہ حال لکھا تھا الباب سلطنت کے ایک سرحدی شہر

کی حیثیت کھو چکا تھا۔ اس کے بعد سے اس کی تاریخ ان دوسری نیم خود مختار ریاستوں کے مشابہ رہی جو کوہستان قفقاز میں واقع تھیں؛ یعنی کبھی تو وہ خود مختار ہو جاتی تھی اور کبھی کسی زیادہ طاقتور پڑوسی کے زیر نگیں آ جاتی تھی؛ چنانچہ پہلے تو یہ ایران کی مملکت میں شامل رہی، لیکن ۱۸۰۶ء میں روسیوں کے قبضے میں آ گئی۔ پچھلی صدی سے اس کے باشندوں کی تعداد میں کچھ تھوڑا سا اضافہ بھی ہوا ہے لیکن یقیناً اسے اب وہ اہمیت حاصل نہیں رہی جو کسی زمانے میں تھی.

مآخذ: (۱) الاِصطَخری، ۱: ۱۸۴ (ابن حوقل میں بعض تفصیلات مختلف ہیں، *BGA*، ۲، طبع ڈخویہ، ۲۴۱-۲۴۲ اور طبع دوم از J. H. Kramers، لائڈن ۱۹۳۸-۱۹۳۹ء، ۲: ۳۳۹-۳۴۰ [وطبع عبدالعال، مصر ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۰]؛ (۲) القزوینی، *Cosmography*، طبع وُسٹنفلٹ ۲: ۳۴۰-۳۴۲؛ قبّ یاقوت، ۱: ۴۳۷-۴۴۲؛ (۳) منورسکی (V. Minorsky): *Studies in Caucasian History*، لنڈن ۱۹۵۳ء؛ (۴) وہی مصنّف: *A History of Sharvān and Darband in the 10th-11th Centuries*، کیمبرج ۱۹۵۸ء؛ (۵) D. M. Dunlop: *History of the Jewish Khazars*، پرنسٹن ۱۹۵۴ء، اشاریہ؛ عمارتی آثار کے لیے: (۶) منورسکی (M. Minorsky): *Decouverte d'inscription pehlevies à Derbend*، در *JA*، ۱۹۲۹ء، ص ۳۵۷-۳۵۸؛ (۷) M. J. Artamonov: *Drevnii Derbent*، در *Sovetskaya Arkheologiya*، ۱۹۴۶ء، ۸: ۱۲۱-۱۴۴.

(D. M. DUNLOP)

---

* **باب اَلّان** = باب اللّان: ''الّانون (Alāns) کا دروازہ''، فارسی: درِ الان، جدید شکل داریال یا دریال درآل (Dariel) وسطی قفقاز میں ایک درّہ، جو کوہ کزبِک (Kazbek) کے مشرقی اور ولاڈی کاوکاس (Vladikavkas) کے جنوب میں واقع ہے۔ اسے ایک شاندار گھاٹی بتایا جاتا ہے، جس میں دریاے تیرک (Terek) سنگ خارا کی چار ہزار سے پانچ ہزار فٹ بلند نوکیلی چٹانوں کے درمیان تیزی سے بہتا ہے اور جسے غالبًا قدما ابوابِ قفقاز (Caucasus Gates) کہا کرتے تھے (دیکھیے Pauly-Wissowa، ۳۲، ۱، عمود ۳۲۵)۔ یہ مقام الان ان لوگوں کے علاقے میں واقع تھا جو اسلام کے ابتدائی دور میں اور اس کے بعد بھی جفاکش پہاڑی لوگوں کا ایک قوی گروہ تھے اور اپنے شمالی و جنوبی قفقاز کے پڑوسیوں سے ممتاز اور بالعموم خود مختار تھے۔ موجودہ زمانے میں ان کے نمائندے، جو اوسٹ (Ossetes) کہلاتے ہیں، اس درّے کے آر پار رہتے ہیں.

اسلامی فتوحات کی پہلی لہر بہ مشکل ہی الان تک پہنچ پائی۔ اس کا ذکر ۱۰۵ھ/ ۷۲۴ء میں آیا ہے جب الجرّاح بن عبداللہ الحَکَمی نے اس راستے سے خَزَریہ پر حملہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے اگلے سال الجرّاح نے الّانیوں سے جزیہ اور خراج وصول کیا (الذّہبی، تاریخ الاسلام، قاہرہ، ص ۴ و ۸۸)، لیکن ۱۰۹ھ/ ۷۲۷ء میں مَسلَمہ بن عبدالملک کو دریال (الیعقوبی، ۲: ۳۹۵) پر قبضہ کرنا پڑا۔ غالبًا اسی زمانے میں مسلمہ نے اس قلعے میں جو اس درّے کی حفاظت کرتا تھا کچھ فوج، جس کا ذکر المسعودی (مروج، ۲: ۴۴) نے کیا ہے، متعیّن کی۔ یہ قلعہ ایک بڑی چٹان پر تعمیر کیا گیا تھا، جس کے نیچے وہ پل تھا جو گھاٹی کے آر پار بنا تھا اور المسعودی کے بیان کے مطابق دنیا کے مشہور ترین قلعوں میں سے ایک تھا۔ تاہم ۱۱۲ھ/ ۷۳۰ء میں خزر اس درے سے حملہ آور ہوے تھے (الطّبری، ۲: ۱۳۱، ۱۵۳)۔ انھوں نے الجرّاح کو ایک خوں ریز لڑائی میں شکست دی اور مالِ غنیمت لے کر واپس جانے سے پہلے اردبیل پر قبضہ کر لیا۔ ۱۱۹ھ/ ۷۳۷ء میں خزریہ کے خلاف لشکر کشی میں مروان بن محمد بذات خود درّۂ داریال سے گزر کر آگے بڑھا اور ابو یزید السُّلَمی کی فوجوں سے، جو باب الابواب کی جانب سے پیش قدمی کر رہی تھیں، ایک مقررہ مقام پر جا ملا۔ یہ اس نہایت ہی کامیاب فوج کشی کی ابتدا تھی جو قفقاز کے شمالی علاقے میں کی گئی، لیکن مروان نے کسی قسم کے مستقل قبضے کی کوشش نہ کی۔ داریال پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے عرب اِکّا دُکّا حملے کرتے رہے، مثلاً یزید بن اُسَید السُّلَمی کے زیر کمان نواح ۱۴۱ھ/ ۷۵۸ء میں (البلاذُری، ص ۲۰۹، ۲۱۰) لیکن یہاں باب الابواب [رکّ بآن] کی طرح کا کوئی مستحکم شہر وجود میں نہ آ سکا۔ المسعودی کہتا ہے کہ اس کے زمانے (یعنی چوتھی صدی/ دسویں صدی میں بھی اس درّے میں عرب قلعہ گیر فوج مقیم تھی، جسے تفلیس سے سامان رسد پہنچتا تھا، جو غیر مسلم علاقے میں پانچ دن کے فاصلے پر واقع تھا (کتاب مذکور)۔ درّۂ داریال کا ذکر مغول کے عہد میں بھی بار بار آیا ہے اور بعد کے زمانے میں بھی اس کی اہمیت قائم رہی.

مآخذ: المسعودی، مُروج، ۲: ۴۳-۴۵؛ (۲) حدود العالم، ص ۴۴۶؛ (۳) D. M. Dunlop: *Hist. of the Jewish Khazars*، پرنسٹن ۱۹۵۴ء، بمدد اشاریہ [(۴) نیز رکّ بہ اَللّان)].

(D. M. DUNLOP)

باب الحَدِید: رکّ بہ دَرِ آہنیں. *

---

* **بابِ سَرعَسکَری**: یا سرعسکر قپوسی، انیسویں صدی میں سلطنتِ عثمانیہ کے دفترِ جنگ کا نام۔ ۱۲۴۱ھ/ ۱۸۲۶ء میں ینی چری فوج کی تباہی کے بعد اس فوج کے آغا کی جگہ ایک اَور افسر مقرر کیا گیا، جو سرعسکر کہلاتا تھا۔ یہ ایک پرانا لقب تھا، جو پہلے وقتوں میں فوجی سرداروں کو دیا جاتا تھا۔ سلطان محمود ثانی کے عہد میں یہ سپہ سالارِ اعظم اور وزیر جنگ کے لیے استعمال ہوا، جو نئی فوج [کی نگرانی] کے لیے خاص طور پر ذمے دار تھا۔ اس کے علاوہ اسے ینی چری کے آغا سے دار الخلافہ میں امن عامّہ، پولیس اور آگ بجھانے کی ذمے داری بھی ورثے میں ملی۔ ایک ایسے زمانے میں جب [حکومت میں] مرکزیت بڑھ رہی تھی اور تغیّر و تبدّل عمل میں آ رہا تھا پولیس کے محکمے کو روز افزوں اہمیت حاصل ہوتی گئی اور اس طرح پولیس کا نظام قائم رکھنا

اور اسے وسعت دینا سر عسکر کے اہم فرائض میں شامل ہو گیا۔ ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء میں سر عسکر سے پولیس کا محکمہ لے لیا گیا اور اس کے لیے ایک علیحدہ محکمہ بنام ضبطیّہ [رک بآن] مُشیریّتی قائم کیا گیا.

محمود ثانی کے عہد میں پہلے سر عسکر کا دفتر اِسکی سرای میں قائم کیا گیا، جہاں سے محل سلطانی کے عملے کے بقیہ چند حصّے ینی سرای میں منتقل کر دیے گئے۔ اس کے بعد ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء میں سر عسکر اور اس کے عملے کے لیے نئی عمارتیں مہیا کی گئیں۔ ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۹-۱۸۹۰ء [کذا۔ صحیح، ۱۸۷۹-۱۸۸۰ء] میں تھوڑی مدت کے لیے اور اس کے بعد ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۸ء [صحیح ۱۹۰۶ء] میں مستقل طور پر عسکریہ کے پرانے نام کی جگہ اسے وزارتِ جنگ (حربیہ) کا نام دے دیا گیا۔ یہ عمارتیں اسی وزارت کے استعمال میں رہیں، یہاں تک کہ دار الحکومت انقرہ میں منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد یہ عمارتیں استانبول یونیورسٹی کو دے دی گئیں.

مآخذ: (۱) محمد اسعد: اُسِ ظفر، استانبول ۱۲۴۳ھ، ص ۱۹۲ ببعد (قب Caussin de Perceval: *Précis historique de la Destruction du Corps des janissaires*، پیرس ۱۸۳۳ء، ص ۲۹۴-۲۹۵)؛ (۲) عبدالرّحمٰن شرف: تاریخ دولتِ عثمانیه، استانبول ۱۳۰۹ھ، ۲: ۴۷۵ ببعد؛ (۳) محمد زکی پکالین: عثمانلی تاریخ دِیمِلری و ترملری سوزلغو، استانبول ۱۹۴۶ء، ببعد، بذیل مادّۂ سرعسکر.

(B. LEWIS)

✱ **باب عالی:** عثمانی ترکوں کے عہد میں ''باب عالی'' کی اصطلاح وزیر اعظم کے عہدے، اس کے دفتر اور اس کی سرکاری قیام گاہ کے لیے استعمال ہوتی تھی، بلکہ اس کا وسیع تر استعمال حکومت عثمانیہ ترکیہ کے لیے بھی ہوتا تھا۔ اس اصطلاح کا استعمال اٹھارھویں صدی سے شروع ہوا۔ اس سے پہلے ترکی وزرا کا دفتر ان کی قیام گاہ (فونق) میں ہوتا تھا۔ سلطان مراد ثانی نے ۸۷۲ھ/ ۱۴۶۷ء میں حکومت کے مرکزی دفاتر کے لیے ایک مستقل عمارت بنوائی، جس کا نام 'پاشا قپوسو' (= پاشا کا دروازہ) مشہور ہوا۔ اس کے بعد اسے ''باب عالی'' یا ''باب آصفی'' کہنے لگے۔ ترکیہ میں اب بھی خدام اپنے آقا کے گھر اور سرکاری ملازم اپنے دفاتر کے لیے ''قپو'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ بادشاہ یا اس کے وزیر کے محل یا دربار کو ''باب'' یا ''آستانہ'' یا ''دربار'' کہنے کا رواج ترکیہ میں ایران سے منتقل ہوا، جہاں یہ اصطلاح ساسانی بادشاہوں کے عہد میں بھی مروج تھی۔ مشرقی ترکیہ میں، 'ایشک' (= دروازہ، عتبہ) کے لفظ سے بھی بعض اوقات یہی مفہوم لیا گیا ہے۔ جاپان میں بادشاہوں کے لیے مِکادو (Mikado) (= باب عالی) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ خود قسطنطینیہ کو مدتوں باب سلطانی اور آستانہ کہا اور لکھا جاتا رہا.

باب عالی کے لیے فرانسیسی اور انگریزی میں Sublime Porte، جرمن میں Hohe Pforte اور لاطینی میں Porta fulgida کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ باب عالی کے دفاتر مختلف عمارتوں میں منتقل ہوتے رہے اور وقتاً فوقتاً آتش زدگی سے انھیں نقصان پہنچتا رہا۔ سب سے آخری دفعہ اسے ۱۹۱۱ء میں آگ لگی۔ اس سے پہلے ۱۷۵۵، ۱۸۲۶، ۱۸۳۹ اور ۱۸۷۸ء میں اس کی عمارتوں کو آگ لگتی رہی۔ ۱۶۵۴ء میں حکومت کے مرکزی دفاتر کے لیے جو عمارت استعمال ہوتی تھی اس کے اور سلطان ترکی کے قدیم محل توپ قپوسرائے کے درمیان صرف ایک سڑک حائل تھی۔ یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو جب عثمانی ترکوں کا عہدِ حکومت ختم ہوا اور اس کی جگہ ترکان احرار نے لی تو باب عالی کے دفاتر ہیئت وفد انقرہ (Grand National Assembly) کے زیر استعمال آ گئے۔ بعد میں یہ عمارت ولایت (ضلع) استانبول کو دے دی گئی.

وہ سڑک جس کا نام 'باب عالی جادہ سی' تھا اب اس کا نام 'اُنقرہ جادہ سی' ہے۔ اس پر کتب فروشوں اور اخباروں کے دفتر عثمانی ترکوں کے عہد سے چلے آتے ہیں.

مآخذ: (۱) آ، لائڈن، طبع اوّل، تکملہ، بذیل مادّہ؛ (۲) آ، لائڈن، طبع ثانی، بذیل مادّہ؛ (۳) آ، ترکی، تحت مادّہ؛ (۴) *Encyclopaedia Britannica*، مطبوعۂ ۱۹۵۰ء، ۱۸: ۲۵۰؛ (۵) البستانی، ۵: ۳ ببعد.

(TAYYIP GÖKBILGIN [و ادارہ])

باب المَشیخَہ: (نیز شیخ الاسلام قپوسی، بابِ فتوٰی یا فتوٰی خانہ)۔ وہ نام ✱ جو سلطنت عثمانیہ میں انیسویں صدی عیسوی میں شیخ الاسلام [رک بآن] یعنی استانبول کے مفتی اعظم کے دفتر یا محکمے کے لیے عام طور پر مستعمل تھا۔ ۱۲۴۱ھ/ ۱۸۲۶ء تک شیوخ الاسلام اپنے فرائض اپنے گھروں ہی میں انجام دیتے اور وہیں سے اپنے فتاوٰی جاری کیا کرتے تھے، اور اگر ان کے گھر زیادہ دور ہوتے تو کرائے کے مکانوں سے۔ اس سال ینی چری فوج کے خاتمے کے بعد سلطان محمود ثانی نے اس فوج کے آغا کا محل، جو جامع سلیمانیہ کے قریب تھا، مفتی اعظم کو دے دیا اور اس طرح اسے ایک مستقل دفتر مل گیا۔ اس اقدام سے، جس کے ساتھ ہی ایک نظارتِ اوقاف بھی قائم کی گئی تاکہ اوقاف کی آمدنی پر مرکز کی جانب سے ضبط و نگرانی قائم رہ سکے، علما کو سرکاری ملازمت میں منسلک کرنے کا راستہ ہموار ہو گیا۔ مالی اور انتظامی خود مختاری سے محروم ہو جانے کے باعث علما حکومت کے مقابلے میں بہت کمزور پڑ گئے اور اپنی اہلیت، اختیار اور مرتبے میں متواتر کمی کو مؤثر طریق سے روک سکنے پر قادر نہ رہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں تعلیمی اداروں اور عدلیہ کا انتظام بھی ان کے ہاتھ سے نکل کر ان نئی مجالس اور وزارتوں کے سپرد ہو گیا جو ان کاموں کے لیے بنائی گئی تھیں؛ بلکہ فتاوٰی لکھنے کا کام بھی، مفتی اعظم کے دفتر میں ماہرینِ قانون کی ایک جماعت کے سپرد کر دیا گیا۔ مفتی اعظم خود بھی اب سرکاری عہدے دار سمجھا جانے لگا اور اپنے محکمے کا افسر اعلٰی اور کابینہ کا ایک رکن بن گیا۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا کہ وزارت کے ساتھ ساتھ اس کی میعاد ملازمت بھی خود بخود ختم ہونے لگی۔ دوسرے وزیروں کے برعکس اس کا تقرر خود سلطان کرتا تھا، نہ کہ وزیر اعظم، جو نظری طور پر رتبے میں اس کے برابر تھا (قب دفعہ ۲۷، آئین

۱۸۷۶ء)؛ تاہم رفتہ رفتہ اس عہدے کا اثر و رسوخ گھٹتا گیا، خصوصاً ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد سے۔ آخر کار ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت کا خاتمہ ہو گیا اور شیخ الاسلام کے منصب کی جگہ، جو ۱۹۲۲ء ہی میں سلطنت کے ساتھ ختم ہو گیا تھا، محکمۂ امور مذہبی نے لے لی جو انقرہ کی وزارت عظمٰی سے وابستہ تھا۔ اس محکمے کا حاکم اعلیٰ (دیانت ایشلری رئیسی) اب جمہوریۂ ترکیہ کا اعلیٰ مذہبی عہدہ دار ہے، جسے مساجد اور عملۂ مساجد کی ذمے داری سپرد ہے لیکن اوقاف، قانون یا تعلیم اس کے ماتحت نہیں ہیں۔ (یہ معلومات وقت تحریر مقالہ حدود ۱۹۶۰ء تک کی ہیں)۔

مآخذ: (۱) علمی سالنامہ سی، استانبول ۱۳۳۴ھ؛ (۲) محمد اسعد: اُسِ ظفر، ص ۱۹۰-۱۹۲، استانبول ۱۲۴۳ھ (قب Caussin de Perceval: *Précis historique de la Destruction du Corps des Janissaires*، پیرس ۱۸۳۳ء، ص ۲۹۳)؛ (۳) عبدالرحمٰن شرف: تاریخ مصاحبٔ لری، استانبول ۱۳۳۹ھ، ص ۲۹۹-۳۱۳؛ (۴) G. Jāschke: *Der Islam in der neuen Türkei*، در *W. I.*، ۱، ۱۹۵۱ء، ص ۸۸ ببعد۔

(B. LEWIS)

---

* **بابُ المَندَب**، بحر احمر اور خلیج عدن کے درمیان کی آبنائیں۔ انھیں آتش فشاں جزیرۂ مَیُّون [رک بآن]، جسے اہل مغرب پرم (Perim) کہتے ہیں، ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے اور ان میں سے ایک بڑی آبنائے (Large Strait) (تقریباً ۱۴ کیلومیٹر چوڑی) اور دوسری چھوٹی آبنائے (Small Strait) (تقریباً ۲ء۵ کیلومیٹر چوڑی) کہلاتی ہے۔ ان میں سے بڑی آبنائے میں سے عموماً بڑے جہاز گزرتے ہیں۔ جون تا ستمبر کی جنوب مغربی موسمی ہواؤں کے زمانے میں پانی کا بہاؤ بحر احمر میں سے باہر کو ہوتا ہے اور نومبر اور اپریل کی شمال مشرقی موسمی ہواؤں کے زمانے میں اندر کو، جس سے ایسے دھارے پیدا ہو جاتے ہیں جو بادبانی جہازوں اور کشتیوں کے آنے جانے کے لیے خطرناک ہوتے ہیں۔ عرب کے ساحل پر المِنْہلی کی پہاڑی (۲۷۰ میٹر بلند) چھوٹی آبنائے کے مشرق میں ہے اور اس کے عین شمال میں الشیخ سعید [رک بآن] واقع ہے، جہاں سے مَیُّون کی طرح بحر احمر میں آنے کے راستے پر قابو رکھا جا سکتا ہے۔

ایک عرب روایت کی رو سے ایشیا اور افریقہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے تا آنکہ ذوالقرنین نے ان دونوں کو چیر کر اس مقام پر الگ الگ کر دیا اور بحر احمر بنا دیا۔ یاقوت کے نزدیک المندب (مرنے والوں پر ماتم کا مقام) کے نام کی ابتدا کا تعلّق اہل حبشہ کے سمندر عبور کر کے یمن میں آنے سے ہے اور الہمدانی اس کا اطلاق جنوبی یمن کے ساحل کے ایک حصے پر کرتا ہے، جس کی تعیین واضح طور پر نہیں ہوئی اور جو بنومجید کے علاقے اور فُرسان کے درمیان واقع ہے۔ المندب میں عنبر (موسوم بہ حشیش البحر) جمع کیا جاتا تھا۔

چھٹی صدی عیسوی کی ابتدا کے دو سبائی کتبوں (Ry ۵۰۷ و ۵۰۸) میں س ل ت (یا س ی ل ت) م د ب ن (=سلسلۃ المندب) کا ذکر اس جنگ کے ضمن میں آتا ہے، جو یوسف اَسْئَر ذُونُواس اور اہل حبشہ کے درمیان ہوئی تھی۔ ممکن ہے یہ کوئی ایسی زنجیر ہو جو اس خلیج کے بہت تنگ اور اُتھلے دہانے کے آر پار، جو الشیخ سعید کے قریب ہے، پھیلا دی گئی ہو، یعنی اگر یہ مان لیا جائے کہ المندب اتنی دور جنوب کی جانب واقع تھا، جیسا کہ آبنائے کے نام میں اس کی موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس قسم کی رکاوٹ ہی شاید اس ناقابلِ قبول روایت کا باعث بنی کہ خود اس آبنائے کے آر پار ایک زنجیر پھیلی ہوئی تھی۔

بابُ المَنْدَب کی ایک شکل باب المَنْدَم بھی ہے، جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ''ب'' کو اکثر ''م'' میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ یہ نام بالخصوص ان عرب ملّاحوں میں عام ہے جو اکثر اس آبنائے کو صرف الباب بھی کہتے ہیں۔

مآخذ: الہمدانی اور یاقوت کے علاوہ: (۱) G. Ferrand: *Instructions nautiques*، پیرس ۱۹۲۱-۱۹۲۵ء؛ (۲) عیسَی القُطامی: دَلِیلُ المُختار فی عِلْمِ البحار، بار دوم، قاہرہ ۱۹۵۰ء؛ (۳) ابن المُجاوِر، در O. Löfgren: *Arabische Texte*، Upsala ۱۹۳۶ء؛ وہی مصنّف، طبع Löfgren، لائڈن ۱۹۵۱ء؛ (۴) المقدسی، طبع ڈخویہ، لائڈن ۱۹۰۶ء، ص ۱۲، ۹۱؛ (۵) W. Caskel: *Entdeckungen in Arabien*، کولون (Cologne) ۱۹۵۴ء؛ (۶) G. Ryckmans، در *Le Muséon*، ج ۶۶ (۱۹۵۳ء)؛ (۷) وہی مصنّف: *La persécution des chrétiens himyarites au sixiéme siécle*، استانبول ۱۹۵۶ء؛ (۸) *Sailing Directions for the Red Sea and Gulf of Aden*، بار سوم، نشر U. S. Hydrographic Office، واشنگٹن ۱۹۴۳ء۔

(G. RENTZ)

---

* **بابِ ہُمایُوں:** (شہنشاہی دروازہ) سلطانِ ترکی کے محل ینی سرای یا طوپ قپوسرای واقع استانبول، کی بیرونی دیوار کا صدر دروازہ۔ مستطیل شکل کی جو عظیم الشان عمارت مسجد آیا صوفیہ کے عقب میں واقع ہے اس میں سے ایک بلند دہری محراب والے دروازے کے ذریعے محل کے پہلے صحن میں داخل ہوتے ہیں۔ بیرونی اور اندرونی دروازے کے درمیانی راستے کے دونوں طرف قپو جیون [دربانوں] کے کمرے ہیں، جو دروازے کے محافظ تھے، رُوکار کے گہرے طاقوں میں یا اُن کے قریب مجرموں کے سر نمائش کے لیے رکھے جاتے تھے۔ دروازے کے اوپر قرآن مجید کی ایک آیت نہایت خوش نما کندہ کی گئی ہے اور اس کے نیچے عربی کا ایک اَور کتبہ ہے، جس میں طوپ قپوسرای کی اس دیوار کا ذکر کیا گیا ہے جو سلطان محمد ثانی نے رمضان ۸۸۳ھ/نومبر-دسمبر ۱۴۷۸ء میں تعمیر کی تھی۔ دروازے پر سلطان محمود ثانی اور سلطان عبدالعزیز کے طغروں میں اس عمارت کی بعض اُن مرمتوں کا ذکر ہے جو بعد کے زمانے میں ہوتی رہیں۔ ابتداءً صدر دروازے پر ایک بالائی منزل بھی تھی جو پچھلی صدی میں تباہ ہو گئی۔ کبھی یہاں ان لوگوں کی املاک رکھی جاتی تھیں جو لاوارث مر جاتے تھے اور کبھی اس عمارت کو خزانے کے دفاتر (archives) یا دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

بہت سے یورپی مصنّفین (بالخصوص انیسویں صدی کے) Hammer: *Staatsverfassung*، ۲: ۹۵ اور d' Ohsson (*Tableau*، ۷: ۱۵۸) کے بیانات کونظر انداز کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ باب ہُمایوں سے مراد باب عالی (حکومتِ عثمانیہ کا دوسرا نام) تھا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مؤخّر الذکر وزیر اعظم کا دفتر اور اس کی قیام گاہ تھی [رکّ بہ باب عالی]۔ یہ فرض کر لینے کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ اصطلاح ''Porte'' جس سے اٹھارھویں صدی عیسوی تک دربار سلطانی مراد تھا، اسی صدر دروازے کے سبب وجود میں آئی، جیسا کہ بعض سیّاحوں (مثلاً Tournefort: *Voyage du Levant*، پیرس ۱۷۱۷ء، ۱: ۴۹۶) کا خیال ہے (قبّ درگاہ؛ قپُو).

مآخذ: (۱) ہزارفن: تلخیص البیان، پیرس، Bibl. Nat.، عدد A. F. turc. ۴۰، ورق ۱۵ اچپ؛ (۲) عبد الرحمٰن شرف، در *TOEM*، ۱: ۲۷۲-۲۷۶؛ (۳) B. Miller: *Beyond the Sublime Porte*، نیو ہیون (New Haven) ۱۹۳۱ء، ص ۴۲-۴۳، ۱۴۱-۱۴۲ (باتصویر)؛ (۴) استانبول موزہ لری: *Guide to the Museum of Topkapu Serai*، استانبول ۱۹۳۶ء، ص ۱-۲؛ (۵) اورز T. Öz.: طوپ قپو سر اینده ...... محمد ثانی یه عائد اثر لر، انقرہ ۱۹۵۳ء (کتبات کے فوٹو)؛ (۶) اکرم حقی آیوردی: فاتح دوری معماری سی، استانبول ۱۹۵۳ء، ص ۳۰۳-۳۱۵ (مع نقشوں کے)؛ (۷) اوزون چار شیلی: عثمانلی دولتنگ سرای تشکیلاتی، انقرہ ۱۹۴۵ء، اشاریہ.

(U. HEYD)

----

* **بابا:** (ترکی و فارسی) بمعنی باپ؛ مشرقی ترکی میں دادا کو بھی کہتے ہیں (Vambéry: *Čagat. Sprach studien*، ص ۲۴۰؛ سلیمان آفندی: لُغاتِ چغتائی، ص ۶۶)۔ نام کے آخر میں بابا معمر آدمیوں کے لیے احتراماً لگایا جاتا ہے اور ترکی میں یہ آج کل بھی کسی کو مخاطب کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ کسی نام کا جزو ہونے کے اعتبار سے اس کی معروف ترین مثال الف لیلۃ ولیلۃ کی علی بابا اور چالیس چوروں کی کہانی میں ملتی ہے۔ لقب کے طور پر یہ لفظ بالخصوص درویشوں کے حلقوں میں استعمال کیا جاتا تھا (مثلاً گیکلی بابا، جس کی بابت مشہور ہے کہ وہ اورخان بیگ کے ہمراہ بروصہ کے محاصرے میں شریک تھا) اور ان میں بالخصوص بیکتاشیوں کے ہاں۔ اخی بابا [رکّ بآن] (نیز اس کی بگڑی ہوئی شکل اَخُو بابا اور دوسری شکلیں) اخی اِیوران [رکّ بآن] کے گدی نشین کا لقب تھا، جس کا تعلق قیر شہر (اناطولیہ) کے تکیے سے تھا اور جو چمڑے کا کام کرنے والوں (مثلاً چمڑہ کمانے والوں، زین سازوں اور جُفت سازوں وغیرہ) کے مرشد تھے۔ ان گدی نشینوں کو حق حاصل تھا کہ جماعت (guild) میں شاگردوں کو داخل کر سکیں۔ روم کے سلجوقی سلطان کیخسرو ثانی کے عہد میں درویشوں کی ایک تحریک رونما ہوئی تھی جو اپنے کو بابائی [رکّ بآن] کہتے تھے۔ بابا کا لقب قدیم سلطنتِ عثمانیہ میں غیر مذہبی ملکی عہدہ داروں کے لیے بھی رائج تھا، مثلاً آغا بابا سی (Barbier de Meynard: *Supplément*، ۱: ۲۵۷)، جو شاہی حرم سرا کے چالیس دربانوں (قپوجی) کا سردار تھا، جو سب کے سب سفید فام خواجہ سرا ہوتے تھے۔ ایران میں یہ لقب نام سے پہلے آتا ہے اور یہاں بھی زیادہ تر درویشوں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے، مثلاً ایرانی عوامی بولی کا شاعر، بابا طاہر عریان [رکّ بہ بابا طاہر]۔ کبھی بابا خود بطور نام کے بھی استعمال ہوتا ہے، مثلاً خوانینِ کریمیا کے خاندان گرای کا رکن بابا گرای خلف محمد گرای، جو اپنے باپ کی موت پر ''کَلغہ'' کے طور پر اس کا جانشین ہوا، لیکن چھے مہینے بعد ہی قتل ہوگیا۔ (۹۲۹ھ/ ۱۵۲۲ء)، نیز ازبک شہزادہ بابا بیگ [رکّ بآن].

کسی جگہ کے نام کے جزو کی حیثیت سے لفظ بابا ظاہر کرتا ہے کہ اس جگہ کا تعلق درویشوں سے رہا ہے، مثلاً بابا طاغی [رکّ بآن]، جو دوبروجہ میں واقع ہے اور جہاں مشہور ولی صاری صَلتِک بابا کا مزار ہے؛ اس کے علاوہ ایک اور بابا طاغی بھی ہے جو دِنِزلی (اناطولیہ) میں واقع ہے نیز غربی اناطولیہ میں وہ دامن کوہ جو بابا بورنو (Burnu؛ سابقہ Assos) کہلاتا ہے۔ یہ کوہ طاوروس کا ایک حصہ ہے اور اس کے دامن میں ایک بندرگاہ بابا لیمانی کے نام سے مشہور ہے۔ مشرقی تھریس (Thrace) میں ایک چھوٹا سا قصبہ بابا اِسکی [رکّ بآن] نام کا ہے.

مآخذ: Barbier de Maynard: *Supplement aux dictionnaires turcs*، بذیل مادّہ؛ (۲) علی جواد: جغرافیائی لغتی، ص ۱۴۳؛ (۳) سالنامۂ ادرنہ (۱۳۲۵ھ)، ص ۹۰۶، ۹۸۰؛ (۴) Texier: *Asie Mineure*، ص ۲۰؛ (۵) اُآ، ترکی، ص ۱۶۵ ببعد (مقالہ از محمد فؤاد کوپرولو).

(F. TAESCHNER)

----

* **بابا اِسحٰق:** رکّ بہ بابائی.

----

* **بابا اِسکی:** (بابائے عتیق) یا بابا اِسکیسی، مشرقی تھریس (Thrace) میں ایک چھوٹا سا قصبہ، جو اِدرنہ سے جنوب مشرق میں پچاس کیلومیٹر دور اس ریلوے لائن پر واقع ہے جو قِرق لراِیلی کو اِدرنہ- استانبول کی بڑی لائن سے ملاتی ہے۔ بوزنطی عہدِ حکومت میں اس کا نام بلغاروفگن (Bulgarophygon) تھا۔ اس کا موجودہ نام ان ترک درویشوں (بابا) سے منسوب ہے جو بلقان میں سلطنتِ عثمانیہ کی توسیع کے بعد یہاں اور دوسرے مقامات میں آ کر آباد ہو گئے تھے.

بابا اِسکی سترھویں صدی میں ویزا (Viza) کے سنجاق میں ایک قضا تھی اور اس کے بعد اسے قرق کلیسا (قرق لراِیلی) کی قضا میں شامل کر دیا گیا۔ آج کل وہ قِرق لراِیلی کی ولایت کی ایک قضا ہے۔ ۱۹۴۵ء میں اس کی آبادی ۵۹۳۶ نفوس پر مشتمل تھی۔ پورے علاقے کی آبادی ۳۷۰۶۷ ہے، جو زیادہ تر زراعت پیشہ ہیں.

اس شہر میں دو مسجدیں ہیں، ایک تو سلطان محمد ثانی کے عہد کی ہے اور دوسری مشہور معمار سِنان نے وزیر اعظم علی پاشا سمیز [رکّ بآن] کے نام پر تعمیر کی تھی.

شہر کے مغرب میں دریائے ارگِنہ پر بنا ہوا سنگی پل ایک تاریخی یادگار کے

طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ پل مراد چہارم کے عہد میں تعمیر ہوا تھا.

مآخذ: سامی، ۲: ۱۱۷۸؛ (۲) مقالہ بابا، در آ، ترکی (از فُواد کوپرولو)؛ (۳) تُرک (انونو) انسیکلوپیدی سی (بذیل مادّہ)؛ (۴) اولیا چلپی: سیاحت نامہ، ۳: ۴۸۰ ببعد؛ (۵) ت۔ گورک بلگین، ۱۵ و ۱۶ عصر لرده ادرنه وپاشالواسی، استانبول ۱۹۵۲ء، ص ۲۰۷ ببعد، ۵۰۲ ببعد.

(E. KURAN)

---

* **بابا اِسکیسی:** رک بہ بابا اِسکی.

---

* **بابا افضل الدین محمد:** بن حسین الکاشانی (یا کاشی)، جو عام طور پر بابا اَفضَل کے نام سے مشہور ہے، ایک ایرانی مفکّر اور شاعر، جس نے رباعیاں لکھی ہیں۔ وہ کاشان کے نزدیک مَرَق میں پیدا ہوا تھا اور وہیں دفن بھی ہوا۔ اس کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں ابھی تک غیر معیّن ہیں۔ بقول سعید نفیسی وہ حدود ۵۸۲ھ/ ۱۱۸۶-۱۱۸۷ء یا ۵۹۲ھ/ ۱۱۹۵-۱۱۹۶ء میں پیدا ہوا اور ۶۵۴ھ/ ۱۲۵۶ء یا ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۵-۱۲۶۶ء میں فوت ہوا۔ براکلمان (۲: ۲۸) نے اس کی تاریخِ وفات رجب ۶۶۶ھ/ مارچ اپریل ۱۲۶۸ء دی ہے اور یہ تاریخ مندرجۂ بالا تاریخ سے قریب ہے، لیکن بقول مِینوی (M. Minovi) بابا افضل اس سے بہت پہلے ساتویں/ تیرھویں صدی کے شروع میں فوت ہو چکا تھا۔ پروفیسر براؤن اور دیگر مصنّفین نے جو تاریخ وفات دی ہے وہ ۶۰۷ھ/ ۱۳۰۷-۱۳۰۸ء ہے۔ یہ تاریخ یقینی طور پر غلط ہے۔ اس کی زندگی کے متعلق ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہیں اور جو ہیں وہ بھی معمولی سی، مثلاً بابا افضل اور نصیر الدین طوسی [رک بآں] میں جو تعلق بتایا جاتا ہے اور جسے بعض لوگوں نے قبول بھی کر لیا ہے وہ دقّتِ نظر سے جائزہ لینے کے بعد ممکن نظر نہیں آتا۔ یہ درست ہے کہ نصیر الدین طوسی کے ایک استاد کا نام کمال الدین حاسِب تھا، جو بابا افضل کا شاگرد تھا۔ بابا افضل کی مدح میں نصیر الدین طوسی سے جو دو رباعیاں منسوب کی جاتی ہیں ان میں سے ایک تو قطعی طور پر اس کی نہیں اور دوسری محض خود اپنی تعریف پر مشتمل ہے۔ یہ بیان کہ نصیر الدین طوسی نے بابا افضل کو خوش کرنے کی خاطر کاشان کو ہلاگو کے حملے سے محفوظ رکھوایا ایک فرضی داستان ہے۔ اس بات کا امکان بھی مشکل ہے کہ بابا افضل اور سعدی کی کبھی ملاقات ہوئی ہو۔ بابا افضل کے خیالات پر باطنیہ عقائد کا اور بوعلی سینا کا اثر تھا۔ بوعلی سے یہ اس بات میں مشابہ ہے کہ یہ بھی عربی اصطلاحات کی جگہ فارسی اصطلاحات استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی تصنیفات میں سولہ رسالے، سوال و جواب پر مشتمل ایک کتاب (جو اس کی وفات کے بعد شائع ہوئی)، کوئی چالیس مختصر مقالے، چھے مکاتیب، رباعیات کا ایک مجموعہ، کچھ غزلیات اور قطعات شامل ہیں۔ یہ تعداد، بالخصوص جہاں تک مختصر مقالوں اور مکاتیب کا تعلّق ہے کسی صورت میں بھی قطعی تصوّر نہیں کی جا سکتی، کیونکہ اس کے بہت سے رسالے اگرچہ فرداً فرداً عرصے سے چھپ رہے ہیں لیکن اس کی تصانیف کے متعلق باقاعدہ تحقیق حال ہی میں شروع ہوئی ہے۔ وہ عموماً فارسی زبان ہی میں لکھا کرتا تھا، اگرچہ بعض اوقات اپنے خیالات کا اظہار عربی میں بھی کر لیتا تھا (دیکھیے مدارج الکمال، جو اس نے بعد میں فارسی میں ترجمہ کر دی)۔ نثر میں اس کی کتابیں فلسفہ، تصوف، اخلاق اور منطق پر ہیں۔ ان کا کچھ حصہ طبع زاد، کچھ تراجم اور کچھ دوسروں کی تصنیفات کی تہذیب و ترتیب پر مشتمل ہے۔ یہ کتابیں سادہ، صاف اور سلیس اسلوبِ بیان کے لحاظ سے ممیّز ہیں۔ اس کا اسلوب بڑی حد تک قدما کے اسلوب کی پیروی کرتا ہے۔ اس نے ارسطو کی تصنیف کتاب النفس کا جو ترجمہ کیا ہے اسے ملک الشعرا بہار نے بے نظیر قرار دیا ہے۔ منطق میں بابا افضل کی المنہاج المبین نفس مضمون کے اعتبار سے ارسطو کی کتاب العلم و المنطق پر مبنی ہے، اگرچہ یہ اپنی اصل کے بالکل مطابق نہیں ہے، بلکہ اس میں مصنف نے اپنے جداگانہ دلائل سے بھی کام لیا ہے۔ بابا افضل کی تصنیف چہار عنوان امام غزالی کی کیمیاے سعادت کا انتخاب ہے۔ اس میں کچھ تو الغزالی کی فارسی تصنیف سے اقتباسات ہیں اور کچھ اس کتاب کے عربی اجزا کے ترجمے جنھیں الغزالی نے اپنے فارسی نسخے میں شامل نہیں کیا تھا۔ بابا افضل کی رباعیاں بے حد دلکش ہیں اور ان میں سے بعض کے تیکھے پن پر H. Whinfield اظہار خیال کر چکا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ ان میں سے متعدّد رباعیات عمر خیام کے نام سے منسوب ہو گئی ہوں.

مآخذ: (۱) محمد تقی دانش پژوہ نے بابا افضل کی تمام مشہور اور شناخت شدہ تصانیف کے تراجم وغیرہ کی فہرست اپنے مقالے نوشتہاے بابا افضل، در مجلۂ مہر (۱۲۳۶ھ ش)، ۸: ۴۳۳-۴۳۶، ۴۹۹-۵۰۲، میں دے دی ہے۔ یہاں خاص طور پر قابلِ ذکر یہ ہیں: تصنیفات مدارج الکمال (دیکھیے اوپر)، راہ انجام نامہ، ساز و پیرایۂ شہان پُر مایہ، رسالہ تُفاحہ، عرض نامہ، جاوِدان نامہ، ینبوع الحیاۃ (ترجمہ از بابا افضل) طبع مجتبیٰ مینوی و یحییٰ مہدَوی، تہران ۱۳۳۱ھ ش، (مطبوعات دانش کدہ، عدد ۱۳، ج ۲، جس میں سوانح حیات کے علاوہ ایک تنقید، اشاریے اور فرہنگ شامل ہے، زیر تکمیل)؛ کتاب التفّاح (سیب نامہ)، جو ارسطو سے منسوب ہے اور جسے فارسی اور انگریزی زبان میں مرجلیوث (D. S. Margoliouth) نے طبع کیا ہے، در *JRAS*، ۱۸۹۲ء، ص ۱۸۷-۲۵۲ (اس مکالمے کے فارسی مترجم کو شناخت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی)؛ ترجمۂ روان شناسی یا رسالۂ نفسِ ارسطو، طبع ملک الشعرا بہار، تہران ۱۳۱۶ھ ش (بابا افضل کا فارسی ترجمہ یا تو ابوزید حُنین بن اسحٰق عبادی (م ۲۶۴ھ/ ۸۷۷-۸۷۸ء) یا اس کے بیٹے اسحٰق (م ۲۹۸ھ/ ۹۱۰-۹۱۱ء) کے عربی ترجمے پر مبنی ہے)؛ رباعیات بابا افضل کاشانی (تعداد ۴۸۳)، تہران ۱۳۱۱ھ ش، مع تنقیدی سوانح اور مکمل تصنیف پر تبصرہ از سعید نفیسی (نیز مع سرورق در فرانسیسی)۔ ان رباعیوں کا ایک انتخاب بھی موجود ہے، جس کا تخیلی نثر میں ترجمہ کیا گیا ہے، در حسین آزاد: *La Roseraie du Savoir, Choix de Quatrains mystiques*، لائڈن ۱۹۰۶ء؛ نیز بابا افضل کے متعلق دیکھیے: (۲) H. Ethé: *Neupersische Literatur*، در *Gr. I. Ph.*، ۲: ۲۷۷؛ (۳) براؤن، ۲:

۱۱۰؛ (۴) براکلمان: تکملہ، ۲: ۳۸۰؛ (۵) J. E. Bertel: *Avicenna i Izvestija AN SSSR. Otdel. persidskaya Literatura*، در *obshestv. nauk.*، ۱۹۳۸ء، عدد ۱-۲: ۸۴-۸۶؛ (۶) *Dějiny perské a tádžické literatury*، طبع J. Rypka، پراگ (Prague) ۱۹۵۶ء، ص ۱۷۸، ۱۵۰، ۱۷۹؛ (۷) بہار: سبک شناسی، ۳ (۱۳۱۹ ھ ش): ۱۶۳-۱۶۶؛ (۸) مجمع الفصحا، ۱: ۹۸ وغیرہ.

(J. RYPKA)

---

* **بابا بیگ:** ایک اوزبک سردار، جو خاندان کنیگیس (Keneges) سے تعلّق رکھتا تھا اور ۱۸۷۰ء تک شہر سبز کا حاکم تھا۔ جب یہ شہر رومیوں نے فتح کر لیا تو وہ چند وفادار ساتھیوں کے ساتھ فرار ہو گیا۔ بالآخر وہ فرغانہ میں گرفتار ہو گیا اور اسے مجبوراً تاشقند میں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ ۱۸۷۵ء میں اس نے روسی فوج میں ملازمت اختیار کر لی اور خوقند کی مہم میں حصہ لیا۔ وہ ۱۸۹۸ء کے لگ بھگ تاشقند میں فوت ہوا.

(B. SPULER و W. BARTHOLD)

---

* **بابا طاغی:** (=باباطغی) ڈوبروجہ [=دوبریجہ] کا ایک شہر، جو اب رومانیا کا ایک حصہ ہے۔ اس کا ترکی نام نیم تاریخی درویش (بابا) ساری صالتق [رک بآں] سے منسوب ہے، جو اناطولی ترکمانوں کی ایک جماعت ساتھ لے کر سترھویں صدی کے وسط میں ڈوبروجہ گیا اور وہاں جا کر بابا طاغی کے نواح میں آباد ہو گیا (اس آبادی کے متعلق دیکھیے Paul Wittek: *Yazijiohglu 'Alī on the Christian Turks of the Dobruja*، در *BSOAS*، ۱۹۵۲ء، ۱۶: ۶۳۹ ببعد)۔ مختلف شہروں میں ساری صالتق کے کئی مقبرے ہیں، لیکن جس مقبرے کو سب سے زیادہ مستند مانا جاتا ہے وہ بابا طاغی والا مقبرہ ہے۔ اس مقبرے کا ذکر سب سے پہلے ابن بطّوطہ کے سفرنامے میں آتا ہے، جو ''بابا صَلتُوق'' کے مقام کو ترکوں کی ایک دور افتادہ چوکی بتاتا ہے اور مختصراً اس ولی کا بھی ذکر کرتا ہے جو وہاں دفن ہے۔ گو ابن بطّوطہ کے متذکرہ مقام بابا صلتوق کی صحیح طور پر تعیین نہیں کی جا سکتی، لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ وہی مقام ہے جو بعد کے زمانے میں بابا طاغی کے نام سے مشہور ہوا۔ ابن بطوطہ اس طرف سے ۱۳۳۲-۱۳۳۳ء میں گزرا تھا.

بقول اولیاء چلبی یہ شہر ترکان عثمانی کے لیے سب سے پہلے بایزید اول نے فتح کیا تھا۔ اسے بایزید ثانی نے ساری صالتق اور اس کے مریدوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ۱۰۷۸ھ/ ۱۶۶۷ء و ۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹ء کی دو دستاویزیں، جو بایزید کے وقف سے متعلق ہیں، طوپ قپوسرای کی فہرست کتب میں شامل ہیں (*Arşiv Kŭlavuzu*، استانبول ۱۹۳۸ء، ۱: ۵۲)۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بایزید اول نے دریاے ڈینوب کی مہم کے دوران میں یہ علاقہ فتح کر لیا تھا، لیکن اس کا آخری الحاق غالباً ۸۱۹ھ/ ۱۴۱۶-۱۴۱۷ء میں عمل میں آیا (عاشق پاشازادہ، باب ۷۵؛ نشری، طبع Unat Köymen، انقرہ ۱۹۵۷ء، ۲: ۵۳۴ ببعد؛ سعد الدین، ۱: ۲۸۴؛ قب عثمان توران: تاریخی تقویم لر، انقرہ ۱۹۵۴ء، ص ۲۱، ۵۷)۔ اس علاقے میں بایزید نے تاتاریوں کو آباد کیا (حاجی خلیفہ: قب Hammer-Purgstall، بار دوم، ۱: ۶۲۹).

۹۴۵ھ/ ۱۵۳۸ء میں سلطان سلیمان نے رومانیا پر اپنی لشکر کشی کے دوران میں یہاں چار روز تک قیام کیا اور ساری صالتق کے مقبرے کی زیارت کی (*Mohačname*؛ Hammer-Purgstall، بار دوم، ص ۱۵۲)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہ علاقہ سلستره (Silistre) کی سنجاق میں شامل تھا، اگرچہ یہ اتنا بڑا نہ تھا کہ اسے قصبات کی فہرست میں شامل کیا جاتا (محمد طیب گورک بلگن: قانونی سلطان سلیمان دوری باشلرنده روم ایلی ایالت لوالری، شهر و قصبه لری، در بلیتن، ۱۹۵۶ء، ۲۰: ۲۵۴-۲۵۵، ۲۶۶-۲۶۷)۔ سولھویں صدی کے آخر اور سترھویں صدی کے آغاز میں اس قصبے اور ضلع کو قفقازیوں اور کریمیا کے تاتاریوں کی دست برد سے کئی دفعہ بہت نقصان پہنچا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں کی کثیر آبادی ترک وطن کر کے جنوب کی طرف ہجرت کر گئی۔ سلطان مراد چہارم کے عہد میں خوجہ کنعان پاشا کی زیر نگرانی یہاں ایک قلعہ تعمیر ہونا شروع ہوا، لیکن اولیاء چلبی جس زمانے (حدود ۱۶۵۳ء) کا حال لکھتا ہے، اس وقت اس قلعے میں کوئی فوج نہیں رہتی تھی اور صرف اس کی بنیادی دیواریں اور برج قائم تھے۔ سترھویں صدی میں بابا طاغی ان ترکی افواج کا مرکز بن گیا جو شمال کی طرف کوچ کر رہی تھیں، چنانچہ زمانۂ جنگ میں یہ جگہ وزیر اعظم کا سرمائی صدر مقام ہوا کرتی تھی۔ ۱۰۰۱ھ/ ۱۵۹۳ء سے یہ شہر ایالت اوزو (Özü) کے گورنر جنرل کا صدر مقام (voyvodlik) رہا ہے۔ اولیاء چلبی کا بیان ہے کہ یہ ایک بارونق تجارتی شہر ہے، جس میں تین ہزار مکانات، تین سو اسّی دکانیں اور کئی باغ ہیں (البتہ کوئی احاطہ مسقّف بازار (بزازستان) نہیں ہے)۔ شہر کی حیثیت پاشا کی جاگیر (پاشا خاصی) کے برابر تھی۔ اولیاء چلبی تین جامع مسجدوں کا ذکر کرتا ہے: اولو جامع، تعمیر کردۂ بایزید ثانی، ساری صالتق کی خانقاہ کے قریب واقع ہے؛ علی پاشا جامع، جو منڈی میں ہے اور دفتر دار درویش پاشا جامع۔ اس نے تین حمّاموں کا بھی ذکر کیا ہے، جن میں حمّامِ بایزید ثانی و علی پاشا شامل ہیں (حاجی خلیفہ صرف پانچ مسجدیں اور دو حمّام بتاتا ہے)۔ اس کے علاوہ کئی مسجدیں، تین مدرسے، لڑکوں کے بیس مکتب (مکتب صبیانی)، آٹھ سرائیں اور گیارہ تکیے بھی تھے۔ ان میں سب سے زیادہ بارونق اور سب سے بڑا تکیہ ساری صالتق کا ہے۔ اس کی تربت ایک زیارت گاہ تھی، جسے بایزید ثانی (یا ایک اَورقول کے بموجب خانِ کریمیا منگلی گرای) نے تعمیر کرایا تھا۔ اولیاء چلبی کا بیان ہے کہ یہاں کی بڑی بڑی مصنوعات کپڑا، کمان اور تیر ہیں اور مشہور چیزیں انگور، نان پاؤ، پنیر (یوغورت) اور افشردۂ انگور ہیں.

۱۸۰۹ء کی روسی ترکی جنگ میں روسی جرنیل پوزورفسکی (Pozorovsky) نے اس شہر پر قبضہ کرلیا۔ ۱۸۱۲ء میں اسے پھر ترکی کو واپس کر دیا گیا، لیکن ۱۸۷۸ء میں یہ رومانیا کے حوالے کیا گیا۔ اس وقت باباطاغی کا شہر طولچہ کی سنجاق اور طُونہ کی ولایت میں ایک قضا تھا۔

مآخذ: (۱) اولیاء چلبی: سیاحت نامہ، ۳: ۳۶۲-۳۷۰؛ (۲) حاجی خلیفہ، مترجمہ Hammer: *Rumeli und Bosna*، وی انا ۱۸۱۲ء، ص ۲۷: (۳) ابن بطّوطہ، ۲: ۴۱۶؛ (۴) Hasluck: *Christianity and Islam under the Sultans*، آکسفرڈ ۱۹۲۹ء، ۱: ۳۶۸-۳۶۹؛ (۵) کمال پاشازادہ: موہاچ نامہ، طبع و ترجمہ Pavet de Courteille، پیرس ۱۸۵۹ء، ص ۸۰ ببعد، ۱۷۷؛ (۶) Hammer-Purgstall، بمد اشاریہ؛ (۷) Hurmuzaki: *Documente*، بمد اشاریہ؛ (۸) آ، ترکی، بذیل مادّہ دوبروجہ (از Aurel Decei)؛ نیز رک بہ بُغدان، دوبروجہ، صاری صالتق.

(B. LEWIS)

---

* **باباطاہر**: ایک صوفی شاعر، جس نے ایران کی ایک مقامی بولی میں اشعار کہے۔ رضاقلی خاں (انیسویں صدی) مآخذ کا حوالہ دیے بغیر کہتا ہے کہ باباطاہر دیلمیوں کے عہدِ حکومت میں زندہ تھا اور اس کی وفات ۴۰۱ھ/۱۰۱۰ء میں ہوئی [قب رضاقلی: ریاض العارفین، جہاں تاریخ وفات ۴۱۰ھ/۱۰۱۹ء درج ہے]۔ اس کی رباعیوں میں سے ایک صنعت معمّا میں ہے [جس سے اس کی تاریخ پیدائش پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

مُوآن بحرم کہ در ظرف آمدستم
موآن نقطہ کہ در حرف آمدستم
بہر الْفی اِلف قدی بر آیہ
اِلف قدم کہ در الْف آمدستم

یعنی] ''میں وہ سمندر ہوں جو کوزے میں سما گیا ہو اور وہ نقطہ ہوں جو حرف میں سمٹ آیا ہو۔ ہر الف (یعنی ہزار سال) میں ایک الف قد پیدا ہوتا ہے۔ وہ الف قد میں ہوں، جس نے اس ہزار سالہ مدت میں ظہور کیا ہے''۔ مہدی خاں نے جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (*JASB*) میں اس رباعی کی عجیب وغریب تشریح کی ہے اور اس سے باباطاہر کا سال پیدائش نکالنے کی کوشش کی ہے.

اس تشریح کی اپج کے باوجود یہ بات صحیح ہے کہ باباطاہر کے متعلق واحد تاریخی شہادت جو ہم تک پہنچی ہے وہ راحت الصُدُور کی ہے (حدود ۶۰۱ھ/ ۱۲۰۴ء [؟۵۹۹ھ/۱۲۰۲ء]، در *GMS*، ص ۹۸-۹۹۔ اس کا مصنّف لکھتا ہے کہ جب سلجوقی سلطان طغرل ہمدان میں داخل ہوا (۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء [قب براؤن، جہاں ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء بھی درج ہے]) تو باباطاہر نے اسے یوں تنبیہ کی: اے ترک! تو [مخلوق خدا] کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ [سلطان بولا: جیسا آپ فرمائیں گے۔ بابا نے کہا: تجھے وہ کرنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ۔ سلطان آب دیدہ ہو گیا اور کہا میں ایسا ہی کروں گا]۔ اس روایت سے باباطاہر کی وفات ۴۴۷ھ سے کچھ آگے جا پڑتی ہے، لیکن یہ رضاقلی کے متذکرۂ بالا بیان کے مخالف نہیں کہ باباطاہر دیلمی بادشاہوں کے زمانے میں پھلا پھولا، یعنی آلِ بویہ اور ان کے اعزہ کا کویہ کے عہد میں، جن کی حکومت ہمدان میں ۴۳۵ھ یعنی ابراہیم ینال کی یلغار تک قائم رہی۔ باباطاہر کی ابن سینا سے بھی صحبت رہی [زوکوفسکی، حاشیہ]، جو ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء میں ہمدان ہی میں فوت ہوا؛ لیکن یہ بیانات کہ وہ ہمدان کے صوفی عین القضاۃ کے قتل کا چشم دید شاہد یا نصیرالدین طوسی (م ۶۷۲ھ) کا ہم عصر تھا محض من گھڑت ہیں.

باباطاہر کو بعض مآخذ میں (قب عربی مخطوطۂ سر انجام وغیرہ، در کتاب خانۂ ملّی، پیرس، عدد ۱۹۰۳) ہمدانی اور بعض میں لُری (لُوری) کہا گیا ہے۔ یہ آخری نسبت لُر [رک بآن] کے ساتھ کچھ حیران کن ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ بابا طاہر اور لُرستان میں وطن کی نسبت کے بجائے کوئی اَور نسبت ہے؟ یہ بات ضرور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گیارھویں صدی میں ہمدان اور لُرستان کے لوگوں میں بہت میل جول تھا اور یہ ہوسکتا ہے کہ شاعر دونوں جگہ رہا ہو۔ خرم آباد میں ایک محلہ ہے، جسے باباطاہر کہتے ہیں (قب *Geogr. Journ.*، جون ۱۹۴۴ء، ص ۴۴۳)۔ اہلِ حق [رک بآن] کے نزدیک باباطاہر کا جو تعلق لرستان سے ہے وہ بھی معنی خیز ہے (قب دیوان، عدد ۱۰۲، ۲۰۰، ۲۷۴)۔ باباطاہر کی رباعیات میں کوہ الوند [رک بآن] کا، جو ہمدان پر سایہ فگن ہے، کئی بار ذکر آیا ہے [E. Heron Allen اور عندلیب شادانی کی مرتبہ رباعیات بابا طاہر میں کوہ الوند کا ذکر نہیں]۔ باباطاہر کا مقبرہ محلہ بُنِ بازار میں شہر کی شمال مغربی جانب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کے پہلو میں اس کی عقیدت مند فاطمہ (ذیل میں دیکھیے) اور مرزا علی نقی کوثری (انیسویں صدی) کے مقابر ہیں۔ عمارت بالکل معمولی سی ہے اور اس میں کوئی دلچسپی کی بات نہیں ہے۔ مقبرے کا ذکر حمداللہ مستوفی کی نزھۃ القلوب (۷۴۰ھ/۱۳۴۰ء، ص ۷۵) میں بھی آیا ہے؛ قب فوٹو، در منورسکی (Minorsky): *Matériaux*، ماسکو ۱۹۱۱ء، ج ۱۱ و Williams Jacson: *A visit to the tomb of Bābā Ṭāhir at Hamadan*، نیز ایک ''جلد میں جو براؤن (E. G. Browne) کو بطور تحفہ پیش کی گئی''، [=عجب نامہ] کیمبرج ۱۹۲۲ء، ص ۲۵۷-۲۶۰.

مازندران میں جو یہ کہانیاں سننے میں آتی ہیں کہ باباطاہر کو اس صوبے سے تعلق رہا ہے قطعاً بے بنیاد ہیں۔ ممکن ہے لرستان سے ترک وطن کرنے والے لوگ (لاک Lāk) اسے اپنے ساتھ وہاں لے گئے ہوں۔ ویسے ایران کے سارے خانہ بدوش لوگ اسے اپنا ہم وطن بنانا پسند کرتے ہیں۔

باباطاہر کی زبان: چونکہ واقعات و روایات اس بات کے حق میں ہیں کہ بابا طاہر ہمدان اور لرستان سے تعلق رکھتا تھا اس لیے یہ بات قرینِ عقل ہے کہ ایران

کے اس خطّے کی زبان کے آثار اس کے کلام میں پائے جائیں۔ چونکہ یہ بولی فارسی زبان کے بے حد قریب ہے اور یہ اشعار ہزاروں آدمیوں کی زبان سے سننے میں آئے ہیں، جو انھیں زیادہ قابل فہم بنانے کی کوشش میں قدیم الفاظ کو جدید الفاظ میں بدل دیتے ہیں [جیسا کہ علی بن ابی طالب بخشی قراباغی نے رباعیاتِ باباطاہر کو مرتب کرتے ہوئے کیا ہے، دیکھیے *The Lament*: E. Heron Allen *of Baba Tahir*، دیباچہ، ص xviii، یہ نسخہ پیرس میں موجود ہے]، اس لیے اس بات کی امید بہت کم ہے کہ قدیم الفاظ کے بدلنے سے اصل متن کی مقامی بولی کی اصلیت برقرار رہ سکی ہو۔ اسی طرح یہ خیال بھی قرینِ قیاس ہے کہ خود باباطاہر نے ماہرینِ زبان کا محض تتبع کرنے کی کوشش کی ہو۔ خُود اس زمانے میں ایک کُرد عیسائی نے دعوٰی کیا ہے کہ اس نے اپنی زبان سے بالکل مختلف زبان یعنی گورانی بولی میں اشعار کہے تاکہ وہ ''اہل حق'' کو اپنا پیغام پہنچا دے (ڈاکٹر سعید خاں، در *Muslim World*، جنوری ۱۹۲۷ء، ص ۴۰).

ہمدان اور خرّم آباد کے درمیان اب بھی بہت سی بولیاں بولی جاتی ہیں، لیکن باباطاہر کی زبان کا ان میں سے کسی ایک سے بھی تعلق معلوم نہیں ہوتا، بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ہر زبان سے کچھ نہ کچھ لیا ہے۔ باباطاہر کی زبان کا فصیح فارسی زبان سے قریب ہونا ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ اس کے برعکس ایسی تبدیلیاں، جیسے نام کو نُوم، دَستم کو دُستم (میرا ہاتھ)، رَفتم کو رُفتم (میں گیا ہوں)، دُور کو دِیر (قبّ Huart، ص ۱۴، دیوان، عدد ۸۲) علاقۂ لُر کی خصوصیات سے ہیں۔ واج = بولنا، کر = کرنا کے مادے کُردوں اور وسطی ایران کی زبانوں میں عام ہیں۔ می کرد = وہ کرتا ہے؛ آے۔ او = وہ آتا ہے اور اس قسم کی ترکیبیں خصوصًا گورانی زبان کی یاد دلاتی ہیں، جو مغربی صوبوں میں بولی جاتی ہے۔ بعض خصوصیات (دیرم بجائے دارم) کی مشابہت ہمیں صرف گازرون (شیراز کے قریب) کی بولی میں ملتی ہے۔

Hadank کی تفصیلی بحث سے بالکل واضح طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ ان رباعیات میں ان بولیوں کی باہمی آمیزش ہے۔ کم از کم ان رباعیوں کی موجودہ صورت میں جو ہمارے علم میں آئی ہیں Huart نے باباطاہر کی زبان کا نام ''مسلم پہلوی'' تجویز کیا تھا، مگر علما نے اسے قبول نہیں کیا.

[باباطاہر کی رباعیات میں عمومًا رباعی کی ایک علامت پائی جاتی ہے کہ ان کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ اور ہم ردیف ہیں۔ غالبًا اسی وجہ سے وہ رباعیوں کے نام سے موسوم ہوئیں۔ لیکن ان کا وزن بحر ہزج مسدس محذوف ہے (--ب/--ب/--ب یعنی مفاعیلن مفاعیلن فعولن) جو رباعی کے عام مروجہ وزن بحر ہزج مکفوف مقصور (مفعول، مفاعیل مفاعیلن فع) کے مطابق نہیں، اس لیے انھیں رباعیاں نہیں کہا جا سکتا۔ اسی وجہ سے اس کے دیوان کے نئے مرتب نے انھیں رباعیات کے بجائے ''دوبیتی'' کا نام دیا ہے]۔ چند باقاعدہ رباعیاں ہیں جنھیں باباطاہر سے منسوب کیا جاتا ہے، مگر یہ انتساب مشکوک ہے [کیونکہ یہ رباعیاں زبان، خیالات اور وزن کے اعتبار سے باباطاہر کی رباعیوں سے مختلف ہیں]۔ باباطاہر کے اشعار کی بحر مقبول عام گیتوں میں بھی ملتی ہے (مرزا جعفر (Korsch) (*Gramm. Pres.*) Yazika، ماسکو ۱۹۰۱ء، ص ۳۰۸).

باباطاہر بحیثیت شاعر: ۱۹۲۷ء تک اس کے کلام کا کل سرمایہ جو ہمارے علم میں تھا ان چند رباعیوں تک محدود تھا جو اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی کی بیاضوں میں ملتی تھیں۔ Huart کی تحقیقات سے ۱۸۸۵ء میں انسٹھ رباعیاں منظر عام پر آئیں۔ پھر ہِرَن ایلن (E. Heron Allen) نے تین رباعیاں دریافت کیں اور کل باسٹھ رباعیاں مع ترجمہ شائع کیں۔ لیکن ان تین رباعیوں کو باباطاہر کی رباعیوں سے کوئی نسبت نہیں۔ ۱۹۰۸ء میں مزید اٹھائیس رباعیات اور ایک غزل کا پتا چلا لیکن یہ بھی الحاقی معلوم ہوتی ہیں۔ Leszczynski نے (جس نے برلن کے مخطوطات استعمال کیے) انھیں رباعیوں اور ایک غزل کا ترجمہ کیا ہے (یہ غزل Huart کی دریافت شدہ غزل سے مختلف ہے)۔ آخر میں فارسی رسالہ ارمغان کے مدیر حسین وحید دَستگردِی اصفہانی نے ۱۳۰۶ھ/۱۹۲۷ء میں باباطاہر کا دیوان تہران سے شائع کیا، جس میں دو سو چھیانوے دوبیتیاں اور چار غزلیں تھیں۔ تتمے میں طابع نے باسٹھ دوبیتیاں، جو ''دوسرے مجموعوں سے'' ملیں اور تین رباعیاں Heron Allen والی شامل کر دیں۔ دیوان کی رباعیات ردیف کی ابجدی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کی گئی ہیں۔ بدقسمتی سے طابع، دیوان کے اس قلمی نسخے کی بابت کوئی تفصیل نہیں دیتا جس سے یہ نسخہ چھاپا گیا۔ ان نئی رباعیوں میں سے متعدد رباعیوں میں طاہر کا نام آتا ہے اور اَلوَند...... وغیرہ کے پہاڑوں کا بھی ذکر ہے۔ اس امر سے ان خصوصیات کی توثیق ہوتی ہے جو باباطاہر کے متعلق معلوم ہو چکی ہیں۔ بعض اشعار ناگزیر تکرار کی وجہ سے کچھ معمولی اور بے کیف سے ہو گئے ہیں۔ بہت سی رباعیوں میں مقامی زبان کی جو چاشنی ہے وہ ان کے مستند ہونے کی دلیل ہے، لیکن باباطاہر کی زبان کی نقل اتار لینا کوئی بہت مشکل کام نہیں۔ اس لیے باباطاہر کی رباعیات کے مستند ہونے کا سوال لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ عمر خیام کی رباعیات کے متعلق پیدا ہوا تھا۔ زکوفسکی (Žukowkski) لکھتا ہے کہ ملّا محمد صوفی مازندرانی (گیارھویں صدی ہجری) کے دیوان میں باباطاہر کی رباعیات ملتی ہیں۔ ایک شخص شاطر بیگ محمد، جو ہمدان کا موجودہ زمانے کا شاعر تھا، اس بات کا مدعی تھا کہ کئی کُردی (پہلوی) رباعیاں، جنھیں باباطاہر سے منسوب کیا جاتا ہے اصل میں خود اس کے فکر سخن کا نتیجہ ہیں (قبّ دیوان، ص ۲۱).

باباطاہر کی رباعیوں میں انتخاب مضامین بہت محدود ہے لیکن ان میں اس کی ممتاز شخصیت نمایاں ہے۔ ہم ان انسٹھ رباعیوں کا جو Huart نے شائع کی ہیں تجزیہ کیے دیتے ہیں، تاکہ ناظر اس کا خود اندازہ کر لے۔ یہ بیشتر رباعیاں عشقِ حقیقی اور عشق مجازی کے بیان میں ہیں۔ یہ بڑی مشکل بات ہے کہ ان دونوں میں حد فاصل قائم کی جا سکے۔ چونتیس رباعیاں تو عشقیہ شاعری کے تحت دونوں

عنوانوں پر برابر تقسیم ہوجاتی ہیں۔ دور باعیاں محض خدا کی حمد میں ہیں۔ باقی میں انفرادی خصوصیات ہیں۔ باباطاہر اکثر اوقات اپنی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوے اپنے آپ کو آوارہ، درویش اور قلندر ظاہر کرتا ہے، جس کے سر پر گھر کی چھت نے کبھی سایہ نہ ڈالا ہو، جو پتھر کو تکیہ بنا کر سوتا ہو اور جسے روحانی پریشانیوں نے دق کر رکھا ہو (عدد ۶ و ۷ و ۱۴ و ۲۸) [چنانچہ ایک رباعی میں وہ کہتا ہے:

مُو آن رندم کہ نامم بی قلندر
نہ خون دیرم نہ مون دیرم نہ لنگر
چو روز آیہ بگردم گرد گیتی
چو شو گردہ بخشتی وانہم سر]

ہموم وافکار اس کے لیے باعث اذیت ہیں [چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے:

ز کشت خاطرم جز غم نرویو
ز باغم جز گل ماتم نرویو
ز صحرای دل بی حاصل مُو
گیاہ نا اُمیدی ہم نرویو]

میرے دل کے کشت زار میں ''غم'' کے سوا کوئی چیز سرسبز نہیں ہوتی۔ میرے باغ میں غم کے پھولوں کے سوا کچھ نہیں کھلتا۔ میرے دل بے حاصل کے صحرا سے گیاہِ نا امیدی بھی نہیں اُگتی۔ باباطاہر سچے صوفیانہ مسلک کا پیرو ہے۔ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوے مغفرت کا طلب گار رہتا ہے۔ (عبودیت) انکسار کی تلقین کرتا ہے اور مرتبۂ فنا کے سوا اپنی شومیِ تقدیر کا کوئی مداوا نہیں پاتا (او ۱۳ و ۴۵ و ۵۰ و ۵۸)۔ [دوسرے صوفی شعرا کے کلام کی طرح باباطاہر کی بھی بعض رباعیاں نظریۂ ہمہ اوست کے بیان میں ہیں].

باباطاہر کی ایک مخصوص انسانی کمزوری یہ ہے کہ اس کی نگاہ اور دل اس دنیا کی چیزوں سے آسانی کے ساتھ جدا نہیں ہوتا۔ اس کا باغی نفس اندر ہی اندر جلتا ہے اور اسے ایک لمحے کے واسطے بھی چین نہیں لینے دیتا اور شاعر کرب واضطراب کے عالم میں پکار اٹھتا ہے:

[مگر شیر و پلنگی ایدل ایدل
بمو دائم بجنگی ایدل ایدل
اگر دستم فتی خونت وریژم
و نِیم تا چہ رنگی ایدل ایدل]

اے دل کیا تو شیر ببر ہے یا کوئی 'پلنگ' ہے۔ تو ہمیشہ مجھ سے لڑتا رہتا ہے۔ اگر تو میرے ہاتھ آجائے تو میں تیرا خون بہا کر دیکھوں کہ اس کا رنگ کیسا ہے؟ (عدد ۳ و ۸ و ۹ و ۲۶ و ۳۶ و ۴۲)۔

باباطاہر کی جذباتیت اور خیّام کے فلسفے میں بہت فرق ہے۔ باباطاہر کے کلام میں عمر خیام (م ۵۱۷ھ/ ۱۱۲۳ء) کی لذّت اندوزی کا کہیں پتا تک نہیں ملتا اور نہ اس صبر وسکون ہی کا نشان ملتا ہے، جو عمر خیام موت سے پیدا شدہ تغیرات کے مقابلے میں ظاہر کرتا ہے۔ اس کے برعکس عمر خیام کے کلام میں باباطاہر کا متصوّفانہ سوز نہیں ملتا (قب Christensen: *Critical Studies in the Rubā'i-yāt of Umar-i Khayyām*، کوپن ہیگن ۱۹۱۷ء، ص ۴۴].

باباطاہر کے کلام میں پسندیدہ بات یہ ہے کہ اس کے جذبات تر وتازہ ہیں اور عام صوفیانہ رسم ورواج کی بندش سے آزاد ہیں۔ اس کی تشبیہات بے ساختہ ہیں اور اس کے بیان وزبان کی سادگی بڑی دل فریب ہے۔ یہ اس کی سرزمینِ وطن کی خصوصیت کی یاد دلاتی ہے۔ اگر آج کوئی نیا Fitzgerald [رباعیات عمر خیام کا مشہور مترجم] پیدا ہوجائے تو وہ باباطاہر کو عمر خیام کا اچھا خاصا رقیب بنا سکتا ہے۔

باباطاہر بحیثیت ایک صوفی: ایرانی درویش، جن سے زکوفسکی (Žukowski) کو باباطاہر کے متعلق گفتگو کرنے کا موقع ملا، بتاتے ہیں کہ وہ بائیس فلسفیانہ رسائل کا مصنّف تھا (قب نیز رضا قلی خاں)، لیکن Éthé اور Blochet کا ممنون ہونا چاہیے کہ ان کے ذریعے ہمیں اس بات کا علم ہوا کہ اوکسفرڈ اور پیرس میں باباطاہر کے اقوال کی شرحیں موجود ہیں۔ مکمل رسالہ [ال] کلمات [ال] قِصار (مختصر اقوال) ارمغان کے ایڈیشن میں چھپ چکا۔ اس رسالے میں تین سو اڑسٹھ عربی مقولے ہیں، جو تیئیس ابواب میں منقسم ہیں اور جن میں مفصّلۂ ذیل مضامین سے بحث کی گئی ہے: علم، معرفت، الہام، فراست، عقل، نفس، یہ عالم یعنی دنیا، عقبیٰ، سماع، ذکر، اخلاص اور اعتکاف وغیرہ۔

نمونے کے طور پر چند اقوال درج ذیل ہیں: مقولہ عدد ۸۶: (الحقیقة المشاهدة بعد علم اليقين) ''حقیقت وہ مشاہدۂ ذات ہے جو علم الیقین کے بعد پیدا ہوتا ہے؛ عدد ۹۶: (الوجد فقدان الموجودات و وجود المفقودات) ''وجد موجودات کے مفقود اور مفقودات کے موجود ہو جانے کا نام ہے؛ عدد ۳۶۸: (من حل به قضاء الله يبقى من غير حركة و من غير ارادة) جس پر قضاے الٰہی وارد ہو جائے تو اس کی حس وحرکت اور قوتِ ارادی مفقود ہو جاتی ہے؛ عدد ۳۰۰: (من قتله الجهل لم يعش ابدا و من قتله الذكر لن يمت ابدا) ''وہ جسے جہالت نے قتل کر ڈالا وہ گویا کبھی زندہ تھا ہی نہیں اور وہ جسے ذکر نے مار ڈالا کبھی نہ مرے گا''.

معلوم ہوتا ہے کلماتِ قصار نے صوفیوں کے حلقوں میں خاصی مقبولیت حاصل کی۔ اس رسالے کا مدیر حسب ذیل شرحوں کا ذکر کرتا ہے: عربی شرح منسوب بہ عین القضاۃ الہمدانی (جو ۵۳۳ھ میں فوت ہوا لیکن اکثر اوقات روایات میں باباطاہر کے تعلق میں ان کا ذکر آتا ہے)۔ ایک اَور عربی شرح، جس کا مصنف نا معلوم ہے۔ عربی اور فارسی شرحیں از ملّا سلطان علی گُنا آبادی۔ فارسی شرح ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۶ء [کذا، صحیح ۱۹۰۸ء] میں طبع ہوئی لیکن اب نایاب ہے۔ مدیر ارمغان امید دلاتے ہیں کہ کسی نہ کسی دن وہ کلمات قصار کو ایک نہ ایک شرح کے ساتھ شائع کر سکیں گے۔

پیرس مکتبۂ اہلیہ (Bibl. Nationale) کے عربی قلمی نسخے شمارہ ۱۹۰۳ میں

بابا طاہر کے پہلے آٹھ ابواب کے اقوال مختصر صورت میں (ورق ۱۰۰ ب تا ۱۰۵ ب) مع شرح (ورق ۴۷ الف تا ۱۰۰ الف) بعنوان الفتوحات الربانیة فی اشارات الهمدانیة موجود ہیں.

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اس کے شارح جانی بیگ العزیزی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، جس نے شوال ۸۸۹ھ [/اکتوبر ۱۴۸۴ء] میں یہ کام شروع کر کے ۲۰ شعبان ۸۹۰ھ/یکم ستمبر ۱۴۸۵ء کو اسے ختم کیا۔ یہ شرح کسی شیخ ابوالبقاء کی فرمائش پر لکھی گئی تھی، جس کے پاس ''اقوال بابا طاہر'' کا یہ نسخہ ۸۵۳ھ/ ۱۴۴۹-۱۴۵۰ء سے تھا۔ علما نے ابوالبقاء کو اس کی شرح لکھنے سے بدیں وجہ منع کیا کہ یہ کتاب نہایت غامض اور عمیق ہے آخر کار ابوالبقاء نے یہ کام جانی بیگ کے سپرد کیا۔ یہ بابا طاہر کے اقوال کی لفظ بلفظ شرح ہے.

متصوّف شعرا (عطّار، جلال الدین رومی، حافظ) کی طرح بابا طاہر کی زندگی اور اس کی کرامات کے متعلق بھی بعض باتیں مشہور ہیں جن کے لیے دیکھیے دیباچہ دیوان، ص ۱۷ اور ہمدان کے قلمی نسخے Žukowski، Heron Allen، Lesezynski.

گوبینو (Gobineau) نے اپنی تالیف ''تین سال ایشیا میں'' *Trois ans en Asie*، پیرس ۱۸۵۹ء، ص ۳۴۴ پر یہ بتایا ہے کہ فرقۂ اہلِ حقّ [رک بآن] کے صاحبِ کمال لوگ ہمیشہ ''مشہور و معروف صوفیوں کی تعریف و توصیف کیا کرتے ہیں بالخصوص بابا طاہر کی، جس کے اشعار لُر بولی میں بے حد مقبول ہیں اور اسی طرح اس کی بہن بی بی فاطمہ کی بھی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں وغیرہ۔ مذہبی کتاب سر انجام کے دست یاب ہو جانے سے ہم اس فرقے [اہلِ حقّ] کے عقائد میں بابا طاہر کا صحیح مقام متعیّن کر سکتے ہیں۔ اہل حق ذاتِ باری کے سات مظہر مانتے ہیں (مثلاً اول خاوندگار، جو روزِ ازل سے بھی پہلے موجود تھا؛ دوم علی؛ سوم بابا خوشین؛ چہارم سلطان اسحٰق [رک بآن] وغیرہ)۔ ہر مظہر کے ساتھ چار فرشتے ہوتے ہیں، جن کے ذمّے خاص خاص فرائض ہیں۔ بابا طاہر کو بابا خوشین کا ایک فرشتہ اور عزرائیل اور نُصَیر کا مظہر مانا جاتا ہے۔ تصوف کی وہ منزل جس سے بابا خوشین کے زمانے کو مطابقت ہے معرفت ہے۔ اس دور کے واقعات لُرستان اور ہمدان میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ سر انجام کے قلمی نسخے میں ''دنیا کے بادشاہ'' کا بابا طاہر کے پاس ہمدان میں آنے کا ذکر ہے، لیکن غالباً یہ روایت سلطان طغرل کے واقعے (دیکھیے مندرجۂ بالا) کی یاد کی وجہ سے مشہور ہو گئی ہے، جس کا راحت الصدور کے حوالے سے اوپر ذکر آیا ہے۔ بابا طاہر اور فاطمہ لارا (دبلی پتلی)، جو علاقۂ گوران کے بار اشاہی قبیلے کی تھی اور جو بابا موصوف کی ملازمہ تھی اُس کا ذکر بھی بابا طاہر کے حالات میں آتا ہے۔ تیرہ مقطعات جو مسخ شدہ ہیں مگر بابا طاہر کی طرز میں ہیں [کتاب سر انجام کے] متن میں جگہ جگہ بکھرے ہوے ہیں (قب منورسکی (Minorsky)، ص ۲۹-۳۳، ۹۹-۱۰۳۔ ان واقعات کو Leszczynski نے پیش نظر رکھا ہے، دیکھیے کتاب مذکور، ص ۱۸-۲۵)۔ فاطمہ لارا جس کا متن میں ذکر ہے، بابا طاہر کے برابر میں مدفون ہے۔ بابا طاہر کے مقبرے کے مجاوروں کے قول کے مطابق یہ وہ فاطمہ نہیں جو اسی احاطے میں دفن ہے۔ گوبینو (Gobineau) اور جیکسن (A.V. W. Jackson) بابا طاہر کی بہن بی بی فاطمہ یا فاطمہ لیلیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ آزاد ہمدانی (دیوان، ص ۱۶-۲۱) بابا طاہر کی دایہ کی قبر کا ذکر کرتا ہے۔ ہر ایک ایسی کوشش میں سرگردان معلوم ہوتا ہے کہ وہ بابا طاہر اور فاطمہ کے باہمی متصوفانہ تعلقات کو سادہ زبان میں بیان کرے.

مآخذ: قلمی نسخے جن میں بابا طاہر کی رباعیات ملتی ہیں حسب ذیل ہیں: (ا) موزۂ قونیہ، عدد ۲۵۴۷ (۸۴۸ھ/ ۱۴۴۴ء): ۲ قطعات، ۸ دوبیتیاں، دیکھیے مینوی: مجلۂ دانش کدۂ ادبیات، تہران، ج ۴، شمارہ ۲، ۱۳۲۵ھ ش، ص ۵۴-۵۹؛ (ب) ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، فارسی، عدد ۹۲۳، فہرست ایوانوف (Ivanow)، ص ۴۲۴ (۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۲ء کا ایک مجموعہ)؛ (ج) پرشیا کے سرکاری کتاب خانے (Preuss. Staatsbibel) کی فہرست مرتبۂ Pertsch، ص ۷۲۷ کا مخطوطہ شمارہ ۶۹۷ (جو ۱۸۲۰ء میں لکھا گیا اور جسے Leszczynski نے استعمال کیا ہے: چھپن رباعیاں؛ (د) مکتبۂ اہلیۂ پیرس (Bibi. Nat. de Paris) ۱۷۴ فہرست فارسی مرتبۂ بلوشے (Blochet)، ۲:۲۹۰-۲۹۲ جمع کردۂ بخش علی قرہ باغی، در ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء): ایک سو چوہتر رباعیاں اور ایک غزل؛ مسجد سپہ سالار تہران کے کتب خانے میں زکوفسکی (Žukowski) کو ایک قلمی مسودہ ملا، بنام حالات بابا طاهر باانضمام اشعارش، لیکن کتاب کے عنوان سے جس مضمون کا اظہار ہوتا ہے وہ کتاب میں موجود نہیں۔ بابا طاہر کے تصوف کے رسالوں کے نسخے یہ ہیں: (ا) مکتبۂ اہلیۂ پیرس کا ایک عربی مخطوطہ شمارہ ۱۹۰۳ (ملاحظہ ہو Blochet کی فہرست، ۲:۲۹۱)؛ (۲) اوکسفرڈ کا ایک مخطوطہ، جس کا Éthé نے کتب خانۂ بوڈلین کے فارسی مخطوطات کی فہرست میں زیر شمارہ ۱۲۹۸ ذکر کیا ہے؛ ملاحظہ ہو ورق ۳۰۲ ب سے لے کر ورق ۳۴۳ تک۔ بیاض ہاے اشعار جن میں بابا طاہر کا ذکر ہے، حسب ذیل ہیں: (ا) علی قلی خان والِہ: ریاض الشعراء، ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء، قب Leszczynski، ص ۱۰؛ (۲) لطف علی بیگ: آتشکدہ (۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء)، بمبئی ۱۲۷۷ھ، ص ۲۴۷ (۲۵ رباعیاں)؛ (۳) علی ابراہیم: صحف ابراهیم، (۱۲۰۵ھ/ ۱۷۹۱ء)، جس کا ایک نادر نسخہ پَرشیا کے سرکاری کتب خانے Preuss. Staatbibl میں موجود ہے، دیکھیے فہرست مرتبۂ Pertsch، ص ۷۲۶، شمارہ ۶۶۳ (جسے زکوفسکی (Žukowski) اور Leszczynski نے استعمال کیا ہے)؛ (۳) رضا قلی خاں: مجمع الفصحا، تہران ۱۲۹۵ھ، ۱:۳۲۶ (۱۰ رباعیاں)؛ (۴) رضا قلی خاں: ریاض العارفین، تہران ۱۳۰۳ھ، ص ۱۰۲ (۲۴ رباعیاں)؛ (۵) بابا طاہر کی ۵۷ رباعیاں ۱۲۹۷ھ اور ۱۳۰۸ھ میں بمبئی سے شائع ہوئی تھیں (مع رباعیات عمر خیام) اور (۶) ۳۲ رباعیاں (مع مناجات انصاری) بمبئی ۱۳۰۱ھ؛ (۷) ۲۷ رباعیاں (مع رباعیات عمر خیام)، تہران ۱۲۷۴ھ میں؛ (۸) بابا طاہر کی ایک غزل دیوان شمس مغربی، تہران ۱۲۹۸ھ، ص ۱۵۸ اور مناجات انصاری وغیرہ میں بطور تتمہ شامل ہے؛ (۹) دیوان باباطاهر (قب متن کلمات قصار)، دیباچۂ مدیر،

سوانح حیات از محمود عرفان، تذکرۂ مقبرۂ باباطاہر از آزاد ہمدانی وغیرہ ارمغان کی آٹھویں سالگرہ کی ایک تقریب میں بطور ضمیمہ (۱۳۰۶ھ ش/ ۱۹۲۷ء) ص ۱ - ۱۲۴، تہران میں شائع ہوا؛ (۱۰) Huart: *Les quatrains de Bābā-Ṭāhir Uryān en pehlévi musulman*، در J. A. Series, viii, Vol.vi.، سلسلہ ۸، ج ۶، نومبر و دسمبر ۱۸۸۵ء، ص ۵۰۲ - ۵۴۵؛ (۱۱) ژوکوفسکی (Žukowski): *Koye čto o B. Ṭāhirě Golishě*، در *Zap.*، ۱۹۰۰ء، ۱۳: ۱۰۴ - ۱۰۸، سوانح، اس کے بارے میں تین حکایات، دو جدید رباعیاں جن میں سے ایک دیوان، عدد ۱۴۶ میں ہے شامل ہیں؛ (۱۲) دیکھیے نیز *Zap.*، ۲: ۱۲؛ (۱۳) E. Heron Allen: *The Lament of Bābā Ṭāhir*، لنڈن ۱۹۰۲ء (اس میں ۶۲ رباعیاں ہیں، مع ترجمہ از مُرتّب اور قطعہ از Elisabeth Curtis Brenton)؛ (۱۴) براؤن (E. G. Browne): [*Lit. His. of Per.*] ۱: ۸۳ - ۸۷ و ۲: ۲۵۹ - ۲۶۱؛ (۱۵) مرزا مہدی علی خاں (کوکب): رباعیات باباطاہر، در *JASB*، ۱۹۰۴ء، عدد ۱، ص ۱ - ۲۹ (Heron Allen کی شائع کردہ رباعیات کا نیا اڈیشن (ایک رباعی کے اضافے کے ساتھ) (ضروری تصحیحات اور دلچسپ شرح)؛ (۱۶) Huart: *Nauveaux quatrains de Bābā Ṭāhir*، در *Spiegel Memorial Volume*، طبع J. J. Modi، بمبئی ۱۹۰۸ء، ص ۱۹۰ - ۳۰۲ (۲۸ رباعیاں اور ایک غزل)۔ اس میں ۱۸۸۵ء کے مجموعے کو، جو حال میں دست یاب ہوا، مکمل کیا گیا ہے: کشکول الفقراء (جس کا اصل نسخہ مسجد محمدیہ (فاتح) قسطنطینیہ میں ہے) کے ایک اقتباس میں، دیوان مغربی میں اور ایک البم (album) (جُنگ) میں رباعیات کے اس دوسرے مجموعے میں، جو Huart نے شائع کیا ہے، قطعات بہت بے ترتیب ہیں۔ ان کے ترجمے پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا؛ (۱۷) منورسکی (Minorsky): *Materiali* ("Materiaux pour servir á l'étude des croyances de la secte persane dite les Ahl-i Haqq on Ali Ilahi") از *Trud Lazarew*، ج ۳۳، *Instituta*، ماسکو ۱۹۱۱ء، ص ۲۹ - ۳۳ (سر انجام سے فقرات کا ترجمہ ماخوذ ہے)، ۹۹ - ۱۰۳ (متن فارسی اور اس پر تعلیقات)؛ (۱۸) G. L. Leszczynski: *Die Rubaiyāt des Bābā Ṭāhir Uryān oder Die Gottestrānen des Herzens, aus d. west-medischen [sic] Originale*، میونخ ۱۹۲۰ء (مآخذ، سوانح اور اشعار کا ترجمہ)؛ (۱۹) K. Hadank: *Die Mundarten v. Khunsār* etc.، در *Kurd. pers. Forsch. v. O. Mann*، سلسلہ ۳، ج ۱، لائپزگ ۱۹۲۶ء، دیباچہ، ص xxxvii تا lv (مذکورۂ بالا تالیف میں باباطاہر کی زبان کے مسئلے کا مکمل مطالعہ ہے اور مآخذ بھی مذکور ہیں)۔

(V. MINORSKY)

---

* **باباطغی**: رکّ بہ باباطاغی۔

---

* **بابافِغانی**: رکّ بہ فِغانی۔

---

* **بابان**: عراقی کردستان کے ایک نامور گھرانے اور حکمران خاندان کا نام۔ گیارھویں/سترھویں صدی کے اوائل میں پِشدار کے علاقے میں ایک گمنام شخص احمد الفقیہ پیدا ہوا۔ اسی سے یہ خاندان چلا۔ اس کے بیٹے نے شہرزُور کے علاقے میں اقتدار حاصل کر لیا اور اس کے پوتا سلیمان بیگ نے تو زبردست طاقت حاصل کر لی۔ انھوں نے قرہ چولان کو اپنا مستقر بنا لیا، جو ۱۱۹۸ھ/ ۱۷۸۳ء میں سلیمانیہ [رکّ بآن] کی تاسیس تک صدر مقام رہا۔ ایران پر ایک ناکام حملے کی وجہ سے اور اس کے باوجود کہ خود اس کے اپنے نو حاصل کردہ علاقے میں اس کی قسمت ڈانواں ڈول رہی، سلیمان بیگ نے سلطان کے ہاں اتنا وقار ضرور حاصل کر لیا کہ وہ اپنے بیٹوں کے لیے امارت کی حیثیت (یا کم سے کم امارت کی سی نمود) ضرور چھوڑ گیا۔ اس کے پوتے بکر بیگ کے ماتحت بارھویں/اٹھارویں صدی کے آغاز میں بابان حکومت، جو اگرچہ ہمیشہ بغایت غیر مستحکم تھی اور باقاعدہ نظام و تنظیم سے بھی عاری و خالی رہی، زاب کوچک سے سرُوان (دِیالہ) تک پھیلی ہوئی تھی۔

بکر بیگ کے اچانک اور سخت زوال کے باوجود اور ترکی اقتدار کے از سرِ نو قیام کے باوصف اس وقت کے بابانی امیر (خانہ پاشا) نے ۱۱۳۶ھ/ ۱۷۲۳ء۔ ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء میں والی بغداد کو ایرانیوں کے خلاف جنگ میں وقیع فوجی امداد دی۔ اس کے بھتیجے سلیمان پاشا کے ماتحت (۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۴ء) بابان کی حکومت کوی (Koy) کی سنجاق، خانقین اور مغربی ایران کے وسیع حصّے پر مشتمل تھی، لیکن اس کی حالت ہمیشہ بڑی مخدوش رہی۔ عراقی ولایات میں ترکی حکّام نے اسے کبھی گوارا نہیں کیا، خاندان کے اندرونی حریفوں نے اس کا ناک میں دم کیے رکھا اور کسی نہ کسی دعوے دار کے ایرانی حلیفوں یا معاونین کے ساتھ مل کر سازشوں یا خود ان کی اپنی سازشوں نے اسے ہمیشہ کمزور کیے رکھا۔ ایسے حالات میں اس بیش بہا امداد کے باوجود جو ان کی طرف سے بغداد کے پاشاؤں کو وقتاً فوقتاً ملتی رہی اس کردِ عمل داری کے متعلق ترکوں کی حکمت عملی میں نہ کوئی استواری پیدا ہوئی نہ عزت و وقار ہی کی کوئی فضا قائم ہوئی، یہاں تک کہ بابان خاندان کے بڑے سے بڑے امرا۔ بالخصوص عبدالرحمٰن پاشا جو ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۹ء۔ ۱۲۲۷ھ/ ۱۸۱۲ء (بعض وقفوں کے ساتھ) برسرِ اقتدار رہا۔ بھی بار بار چند ماہ یا سال کے بعد سرحدی لڑائیوں اور سازشوں کے باعث یا اپنے بھائیوں یا بھائی بندوں کی رقابتوں اور عداوتوں کی بدولت گردشوں اور انقلابوں کا ہدف بنتے رہے، چنانچہ ایک سے زیادہ مرتبہ اس علاقے پر ترکی اور ایرانی فوجوں کا قبضہ ہوا۔

بابان فرماں رواؤں کا آخری اور قطعی اخراج جو یوں بھی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۰ء کے بعد ترکی حکومت کی تجدیدی حکمت عملی کے باعث ناگزیر ہو گیا تھا، ترکی ایرانی اتحاد کے آثار کے ظہور (دونوں حکومتوں کے مابین ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۳ء اور ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۷ء میں سرحدوں کے معاملے میں اتفاق ہو گیا تھا) کے بعد سے نیز عبدالرحمٰن

پاشا کے بیٹوں کی مہلک رقابتوں کے باعث اَور بھی آسان ہو گیا۔ ایک مختصر سے زمانۂ امن وسکون کے باوجود، جب کہ بابان کی مسلّح فوجوں میں جدید اسلحہ اور جدید فوجی طریقے رائج کر دیے گئے، بالآخر ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۰ء میں وہ مساعی کامیاب ہوئیں جو والیانِ عراق تمام علاقوں میں ایک مرکزی حکومت قائم کرنے کے لیے نصف صدی تک کرتے رہے تھے اور آخر بابانی امیر کو بھی سلیمانیہ سے جانا پڑا۔ اس خاندان کے بہت سے لوگ اب بھی موجود ہیں.

مآخذ: (۱) S. H. Longrigg: *Four Centuries of Modern Iraq*، اوکسفرڈ ۱۹۲۵ء؛ (۲) عباس العزّاوی: عشائر العراق، ج ۲، بغداد ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء؛ (۳) محمد امین زکی: تاریخ السلیمانیة وانحائها، بغداد ۱۹۵۱ء.

(S. H. LONGRIGG)

---

* **بابائی:** مغول کے حملے سے کچھ عرصہ پہلے کی ایک مذہبی اور مجلسی تحریک، جس نے ایشیائے کوچک کے تمام ترکمان مراکز میں ہل چل برپا کر دی تھی۔ یہ تحریک ترکوں کی مجلسی اور ثقافتی ارتقا کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ سلاجقہ کی رومی سلطنت کے بعض عام حالات کے غائر مطالعے سے اس تحریک کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی تک یہ سلطنت کا ایک مضبوط انتظامی اور ثقافتی ڈھانچا بن چکا تھا جو دراصل ایرانی اثرات کا نتیجہ تھا اور جو مسلمانوں، بالخصوص شہری سنّی مسلمانوں، کے خیالات پر مبنی تھا۔ دیہاتی اور سرحدی علاقوں کے ترکمان جو پرانی ترکی روایات کے زیادہ پابند رہے تھے اور جن کے عقائد وخیالات میں بڑی حد تک لچک پیدا ہو چکی تھی، بعد میں پیش از پیش الگ ہوتے گئے۔ عین اس وقت جب حکومت اور ترکمان عنصر کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع ہو رہی تھی ان ترکمانوں کے آجانے کے باعث جنھیں پہلے خوارزمیوں اور پھر مغول نے دھکیل باہر کیا تھا اس علاقے کے ترکمانوں کو ایک طرف تو مزید کمک حاصل ہو گئی لیکن دوسری جانب ان کی آئندہ کی تکالیف و مصائب کا بیج بو یا گیا۔ یہ مصائب ان عقائد کی شکل میں ظاہر ہوئے جن کا منبع وسطی ایشیا کے علاقے تھے۔ یہ حالات تھے جب ۶۳۸ھ/ ۱۲۴۰ء سے کچھ پہلے ایک بابا (عوامی واعظ) جو خود کو ''رسول'' کہتا تھا (نعوذ باللہ)، سرحد شام کے علاقے کَفَرسُود سے آیا اور ترکمانوں کے علاقوں یعنی مشرقی طاوروس کے جنوبی حصّے، اور اماسیہ کے علاقے اور بعد ازاں تمام بیچ کے اور گرد وپیش کے علاقوں کے ترکمانوں میں وعظ وتلقین کرنے لگا۔ اس واقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہ کیخسرو اور خوارزمیوں کے مابین جن کے بچے کھچے لوگوں نے کچھ عرصے کے لیے ایشیائے کوچک میں سکونت اختیار کر لی تھی اور پھر الجزیرہ میں پناہ گزیں ہو گئے تھے، اختلافات کی وجہ سے [سلجوقی] حکومت کم زور ہو گئی تھی، اس نے عَلَم بغاوت بلند کر دیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے بڑے بڑے لشکروں کو شکست دی اور آخر میں صرف ''فرنگی'' (Franks) کرائے کے سپاہیوں کی مدد سے اسے شکست ہوئی اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن پھر بھی یہ تحریک پورے طور پر دبائی نہ جا سکی.

اس تحریک کی امتیازی خصوصیات کے متعلق معلومات بہت کم ہیں۔ اس کے پیرو سرخ ٹوپیاں (جیسا کہ بعد کے زمانے میں قِزِلباش بھی پہنا کرتے تھے)، کالے لبادے اور کھڑاؤں پہنا کرتے تھے۔ اسحٰق اپنے آپ کو نبی بتاتا تھا (نعوذ باللہ) اور اپنے مذہب میں غلو رکھتا تھا۔ یہ مسئلہ ہنوز تشنۂ تحقیق ہے کہ ایک اَور خراسانی بابا الیاس نامی اور ایشیائے کوچک کے (جوالیقی) قلندروں سے اس کے اصل تعلقات کیا تھے۔ بہرحال یہ تحریک اساسی طور پر جلال الدّین رومی اور سلسلۂ مولویہ کی تحریک کے بالکل خلاف تھی.

گو اس تحریک کے متعلق ہماری معلومات کم ہیں لیکن بابائی تحریک واقعی بے حد اہم ہوگی کیونکہ سلجوقی مُؤرّخ ابن بی بی (عکسی طباعت، ص ۴۹۸-۵۰۲، Houtsma کی ملخّص طبع، ص ۲۲۷-۲۳۱) اور معاصر عرب مؤرّخ سبط ابن الجَوزی، طبع Jewett، ص ۸۴۵) پادری Simon باشندۂ St. Quentin (در Vincent باشندۂ Beauvais: *Speculum*، ص ۱۳۱، ۱۴۰) اور اس کے کچھ بعد شامی مؤرّخ ابن العبری (Bar Hebraeus) (طبع وترجمہ Budge، ص ۴۰۵، ۴۰۶) میں اس تحریک کا ذکر موجود ہے۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس تحریک اور ایک طرف قرہ مانی ریاست طاوروس کے قیام اور دوسری طرف اس صدی کے دوسرے نصف میں حاجی بیکتاش کے مذہبی گروہ کے آپس کے تعلقات کا پتا لگایا جائے۔ افلاکی (Huart کے ترجمے کی اصلاح ۱: ۲۹۶ بہ تقلید کور پرولو، *Orig* (دیکھیے ماخذ) ص ۴۰۷) صاف الفاظ میں لکھتا ہے کہ موخّر الذّکر کا، جس کی قسمت میں ایسے اہم واقعات لکھے تھے، بابائی تحریک سے یقیناً تعلّق تھا۔ مغولی سیادت کے زمانے میں اَور بھی کئی مقبول عوام فرقے پیدا ہوے جو قابلِ غور ہیں۔ اگرچہ متون متعلقہ بے حد مبہم ہیں لیکن اس کے متعلق شک وشُبہہ کی گنجائش کم رہ جاتی ہے کہ بابائی تحریک ایسی لہروں کی رہنما بن گئی جن سے سلجوقی سلطنت کے درہم برہم ہو جانے کے بعد بچنا مشکل ہو گیا اور اسی وجہ سے اس تحریک کو اہمیت حاصل ہوئی.

مآخذ: ان کا ذکر مقالے میں موجود ہے۔ بڑی بڑی موجودہ زمانے کی تصانیف یہ ہیں: (۱) محمد فؤاد کور پرولو: ترک ادبیا تنده ایلک متصوّفه لر، انا دولو اسلامیت (ادبیات فاکولته مجموعه سی، ج ۲، ۱۹۲۲ء)؛ (۲) *Les Origines du Bektachisme*، (تاریخ مذاہب پر بین الاقوامی کانگریس، ۱۹۲۳ء)؛ (۳) اندلو بیلکلری تاریخنه عائد نوته لر (ترکیات مجموعه سی، ج ۲)؛ (۴) *Les Origines de le Empire Ottoman*، پیرس ۱۹۳۵ء؛ مزید قدیم مآخذ کے لیے دیکھیے: (۵) اے گول پنارلی: مولانا جلال الدین، ۱۹۵۲ء اور (۶) توران (O. Turan): سلجوق ترکیه سی دین ترقّینه دائر برقیناق، در فؤاد کور پرولوزار مغانی، ۱۹۵۳ء.

(CL. CAHEN)

---

* **بابُر:** ظہیر الدین محمد، ہندوستان میں پہلا مغل فرماں روا، توزک نویس اور شاعر؛ باپ کی طرف سے اس کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں تیمور سے ملتا ہے

اور ماں قُتلُوک [قتلق، درفرشتہ؛ بابر نامہ] نگار خانم تھی، جس کا سلسلۂ نسب پندرھویں پشت میں چنگیز خان سے جا ملتا ہے۔ وہ ۶ محرم ۸۸۸ھ/ ۱۴ فروری ۱۴۸۳ء کو پیدا ہوا۔ رمضان المبارک ۸۹۹ھ/جون ۱۴۹۴ء میں بطور میرزا سے فرغانہ اپنے والد کا جانشین ہوا۔

بابُر کو اپنے بھائی بندوں کے ساتھ وسط ایشیا کے زرخیز علاقوں اور شہروں میں جنگ وجدال ورثے میں ملی تھی۔ ربیع الاول ۹۰۳ھ/نومبر ۱۴۹۷ء تک اس نے اپنے بڑے چچا سلطان احمد میرزا سمرقندی اور اپنے بڑے ماموں سلطان محمود تاشقندی کی ان تمام مساعی کو، جو وہ اسے فرغانہ میں باپ کی گدی سے محروم کرنے کے لیے کرتے رہے، ہمیشہ کے لیے ختم کر کے رکھ دیا، اور اپنے چچازاد بھائیوں کی باہمی مناقشت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سمرقند پر بھی قبضہ جما لیا۔ اس کے چار ماہ بعد مالِ غنیمت کی قلّت سے، نیز اپنے صدر مقام اندیجان میں اپنے خلاف سازش کی وجہ سے اُسے مجبوراً سمرقند چھوڑنا پڑا، مگر اندیجان پر اس نے جلد ہی دوبارہ قبضہ کر لیا اور پھر اتنی ہی جلد تَنبَل کی ماتحتی میں مغول کے حوالے کر دیا، جو اس کے بھائی جہانگیر کے برائے نام معاون تھے۔ ۹۰۵ھ/ ۱۴۹۹ء میں بابر نے فرغانہ کو اپنے بھائی کے ساتھ تقسیم کر لیا اور اسی سال شادی بھی کی؛ پھر سمرقند پر حملہ کیا ہی چاہتا تھا کہ شیبانی خاں اوزبک نے سبقت کر کے شہر پر قبضہ کر لیا، مگر آئندہ سال بابر نے شہر پر اچانک ہلّہ بول دیا اور اس سے سمرقند چھین لیا، لیکن شیبانی خاں نے رمضان ۹۰۶ھ/اپریل-مئی ۱۵۰۱ء میں سِرپُل پر اسے شکست دی اور سامانِ رسد کی قلّت کی وجہ سے بابُر کو سمرقند چھوڑنا پڑا۔ جب اس نے سمرقند پہلے فتح کیا تھا تو اندیجان اپنے بھائی کو دے آیا تھا۔ اب سمرقند چھن جانے پر اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہ رہی اور وہ ایک خانہ بدوش پناہ طلب کی حیثیت سے اپنی جان کی حفاظت کے لیے بھی اپنے بھائی بندوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے چچاؤں نے (جو بادل ناخواستہ ہی اس کے میزبان بنے ہوئے تھے اور تاشقند اور شمالی مغولستان کے خان تھے) تَنبَل کے خلاف اسے افواج بہم پہنچائیں اور بالآخر خود بھی اس کی مدد کے لیے نکلے، مگر تنبل نے شیبانی خاں سے اعانت کی درخواست کی، جس نے ذوالحجّہ ۹۰۸ھ/جون ۱۵۰۳ء میں ان خوانین کو ارچیان کے مقام پر شکست دے کر تہ تیغ کر دیا۔

قریب قریب ایک سال تک بابر تھوڑے سے ہمراہیوں کی معیت میں سُخ اور ہُشیار (Hushyār) کے دور افتادہ خانہ بدوشوں کی میزبانی میں اپنی زندگی کی خیر مناتا پھرا۔ لیکن شیبانی خاں کی مسلسل کامیابیوں نے بابر کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنا مستقر کسی ایسے علاقے میں بنائے جس سے اوزبک کا کوئی خاص مفاد وابستہ نہ ہو۔ محرم ۹۱۰ھ/جون ۱۵۰۴ء میں اس نے کابل کا رخ کیا، جس پر ۹۰۷ھ/ ۱۵۰۱ء تک اس کے کا قبضہ تھا لیکن اس وقت اَرغُون کے قبضے میں تھا۔ بابر نے اپنے بھائی اور کچھ ان لوگوں کے ہمراہ جو اوزبکوں سے بھاگ کر آئے تھے کابل فتح کر لیا اور گرد ونواح کے افغان قبیلوں پر کامیابی کے ساتھ وصولیِ خراج کا حق جما لیا۔ ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵ء تک بابر اس قابل ہو گیا کہ جب سلطان حسین میرزا بایقرا نے درخواست کی تو اوزبکوں کے خلاف اس کی مدد کے لیے کابل سے ہرات آ سکا۔

سلطان بایقرا کی موت اور اس کے بیٹوں کی نا اہلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیبانی خاں نے خراسان کا بیشتر حصہ فتح کر لیا؛ لہٰذا بابر کو ایک بار پھر کوہ ہندوکش کو خالی ہاتھ عبور کرنا پڑا۔ ۹۱۳ھ/ ۱۵۰۷ء میں اس نے ارغونوں سے قندہار لے لیا، مگر جب شیبانی خاں نے اس نئے مفتوحہ شہر کو محصور کر لیا تو اسے بچانے کے بجائے بابر نے ہندوستان کا رخ کیا، لیکن [اسی اثنا میں] شیبانی خاں کی شاہ اسمٰعیل صفوی سے مڈھ بھیڑ ہو گئی، جس نے اسے (شیبانی کو) یکم رمضان ۹۱۶ھ/ ۲ دسمبر ۱۵۱۰ء کو مرو کے مقام پر شکست دے کر قتل کر ڈالا۔

اس پر بابر نے رجب ۹۱۷ھ/اکتوبر ۱۵۱۱ء کو تیسری بار سمرقند پر قبضہ کر لیا لیکن شاہ اسمٰعیل کے متوسّل کی حیثیت سے اس نے غالباً اپنے آقائے عالی قدر کے نام کا سکّہ بھی جاری کر دیا، دیکھیے مآخذ (سکّوں کی شہادت اس بارے میں مشکوک اور مبہم ہے) اور جب صفر ۹۱۸ھ/مئی ۱۵۱۲ء میں اسے کُلِ مَلِک کے مقام پر اوزبکوں کے ہاتھوں شکست ہوئی تو اسے شہر چھوڑنا ہی پڑا۔ ۳ رمضان المبارک ۹۱۸ھ/ ۱۲ نومبر ۱۵۱۲ء کو عُجُوان کے مقام پر نہایت ہی تند اور متشدد مزاج صفوی سپہ سالار نجم ثانی کے شکست کھا جانے پر (جس کا بابر نے جلد ہی ساتھ چھوڑ دیا) اس شہر کو، جو اس کی نظر میں عزیز ترین تھا، حاصل کرنے کی آخری آرزو بھی ختم ہو گئی۔ بابر قندز کے علاقے میں دو سال تک دوڑ دھوپ کرنے کے بعد کابل واپس چلا آیا۔ اس کے بعد مشرق وجنوب کے زیادہ زرخیز علاقے اس کی یلغاروں کا مرکزِ توجہ ہو گئے۔ ارغونوں سے قندہار کو واپس لینے کی متعدد کوششیں بالآخر بذریعۂ گفت وشنید جمادی الاُخریٰ ۹۲۸ھ/مئی ۱۵۲۲ء میں قندہار پر قبضے کی صورت میں منتج ہوئیں۔ اسے حاصل کر لینے کے بعد بابر نے اپنی پوری توجہ ہندوستان کی طرف مبذول کر دی جہاں کے حالات وہ ۹۲۲ھ/ ۱۵۱۶ء سے چھوٹی چھوٹی مہمّوں کے ذریعے معلوم کرتا رہا تھا۔

فاتحِ قندہار (بابر) کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت لاہور کے دولت خان لودھی اور ابراہیم لودھی بادشاہِ دہلی کے چچا عالم خاں نے دی تھی، تاکہ وہ آ کر ابراہیم کے خلاف انھیں مدد دے۔ اپنی دوسری چڑھائی کے موقع پر بابر نے دولت خاں کو تو بے دخل کر دیا اور افغانوں کی تائید حاصل کرنے کے لیے عالم خاں کو استعمال کیا اور رجب ۹۳۲ھ/اپریل ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کی فوجوں کا قلع قمع کر کے دہلی اور آگرے پر قبضہ کر لیا، بلکہ اس کی فوجیں مشرق کی طرف دریائے گنگا کی سمت یلغار کرتی ہوئی جون پور اور غازی پور تک پہنچ گئیں۔ جُمادی الاولیٰ ۹۳۳ھ/مارچ ۱۵۲۷ء میں بابر نے خانُوا کے مقام پر چتوڑ کے رانا سانگا پر فتح پائی۔ اس سے راجستھان میں اس کی فوجی حیثیت اَور مضبوط ہو گئی۔ اور شعبان ۹۳۵ھ/مئی ۱۵۲۹ء میں گوگرہ اور گنگا کے مقامِ اتصال

پر مشرقی افغانوں پر اس کی فتح نے اس کا تفوّق و اقتدار ہندوستان میں بنگال تک قائم کر دیا۔ اُس نے ۶ جُمادی الاولیٰ ۹۳۷ھ/ ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء میں آگرے میں وفات پائی۔ [بابر کی تاریخ وفات ''بہشت روزی باد'' سے نکلتی ہے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ ہمایوں بیمار ہو گیا اور کسی علاج معالجے سے فائدہ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ آخر میر ابوالبقا نے کہا: اب معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادے کی زندگی کسی صدقے کی طالب ہے اور تجویز کی کہ وہ قیمتی الماس جو سلطان علاء الدین کے جواہر خانے سے حاصل ہوا تھا صدقے میں دے دیا جائے۔ بابر نے کہا وہ پتھر کا ٹکڑا میری اور میرے بیٹے کی جان سے زیادہ عزیز اور قیمتی نہیں ہے۔ ہمایوں کے بعد میری اپنی جان مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے اس لیے اس پتھر کے بجائے اپنی جان ہی کو بیٹے پر نثار کیے دیتا ہوں۔ شاید اللہ تعالیٰ اس نذر کو قبول فرمالے؛ چنانچہ بابر خلوت میں گیا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور بیٹے کی صحت کے لیے تضرع سے دعا مانگی اور باہر آ کر تین مرتبہ بیٹے کی چارپائی کے گرد چکر لگا کر کہا، ''برداشتم، برداشتم، برداشتم''، یعنی میں نے اس کی بیماری اپنے سر لے لی۔ بس اسی دن سے ہمایوں کی صحت کے آثار پیدا ہو گئے اور بابر بیمار پڑ گیا۔ آخر بابر اسی بیماری میں فوت ہو گیا۔ (خافی خاں: منتخب اللباب)]۔ کئی سال بعد اس کی لاش کابل منتقل کر دی گئی اور اپنے موجودہ مزار یعنی کابل کے باغوں میں سے ایک باغ میں اسے دفن کیا گیا۔

بابر سیاسی قسمت آزماؤں کے ایسے طبقے میں پیدا ہوا تھا جو ہنوز نیم خانہ بدوش تھے اور وسط ایشیا میں قوّت و اقتدار کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے جنگ و جدال کرتے رہتے تھے۔ تاکہ انھیں اس علاقے کے چرواہوں اور کھیتی باڑی کرنے والے لوگوں نیز اُس علاقے کے صنّاعوں اور تاجروں سے آمدنی حاصل کرنے کا اختیار مل جائے جو چین و ہندوستان اور عراق کے مابین قافلوں کی آمد و رفت سے بہت دولت مند ہو گئے تھے۔ اپنے رقیبوں اور دشمنوں کی طرح اس کا دورۂ حیات بھی دراصل اپنے خاندان اور قبیلے والوں کی حمایت یا مخالفت پر منحصر تھا نہ کہ لسانی یا قومی ریاستوں پر۔ اس کے نسب نے اسے اونچے فرماں روا طبقے میں بار پانے کا موقع دیا۔ یورشوں اور یلغاروں میں اس کی کامیابیاں زیادہ تر اس کے دل کش ذاتی اوصاف، گر کر سنبھلنے کی ہمت، اہتمام کی صلاحیت، شجاعت، تہذیب یافتہ اور ہشاش بشاش طبیعت اور اس کے رفقائے کار کی صفات پر مبنی تھیں۔ وہ ایک محتاط سپہ سالار تھا اور اس نے بڑے بڑے اوزبک فوجی افسروں سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اس نے ہندوستانی مہمات کے زمانے میں نظم و نسق، مورچہ بندی، خندق سازی، تفنگ افگنی، گولہ باری اور فوج کو گھیرے میں لے لینے کے اصولوں کو نہایت مؤثر اور نتیجہ خیز طریق پر استعمال کیا۔ اس کے تجربات نے نہ صرف اس کے اپنے کنبے کے تیموریوں کی چھوٹی چھوٹی ہزیمت خوردہ مگر حوصلہ مند ٹکڑیوں کو متحد رکھا بلکہ دوسرے مغلوں کو بھی، جو کابل میں اس کے گرد جمع ہو گئے تھے اور کچھ زیادہ بااعتماد نہ تھے، مجتمع رکھا۔ تا آنکہ فتح و کامیابی کی بدولت اس کی قوت حکمرانی مسلّم ہو گئی اور کسی کو بھی مجال انکار نہ رہی۔

مآخذ: (۱) ظہیر الدین بابر: بابر نامہ، حیدر آباد [دکن] کے ترکی متن کا ملخّص مرتبۂ A. S. Beveridge، لائڈن۔لنڈن ۱۹۰۵ء؛ انگریزی ترجمہ، لنڈن ۱۹۲۱ء، توزک بابری کے متن کی صحت پر مآخذ کے لیے دیکھیے Storey، ۱: ۵۳۰ - ۵۳۵؛ (۲) نیز H. Beveridge: *The Babarnama Fragments*، در *JASB*، سلسلۂ جدید، ج ۴، ۱۹۰۸ء؛ (۳) *A Dubious Passage in the Ilminski edition of the Bābernāma*، در *JASB*، سلسلۂ جدید، ج ۷، ۱۹۱۱ء؛ (۴) *Obscure Passages in Babar's Memoirs*، در *JARS*، ۱۹۱۰ء، ۱۹۱۷ء؛ (۵) A. S. Beveridge: *Anfrage nach dem Verbleib eines verlorenen MS des Bābarnāma*، در *ZDMG*، ۱۹۰۴ء؛ (۶) ایک وصایا نامہ کی صحت کے لیے، جسے بابر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے قبؔ A. S. Beveridge: *Paternal Counsels attributed to Bābur, in a Bhopal MS*، در *JRAS*، ۱۹۲۳ء؛ (۷) N. C. Mehta: *Babur's last Testaments*، در *Twentieth Century*، جنوری ۱۹۳۶ء؛ اور (۸) S. K. Banerji: *Babur and the Hindus*، در مجلہ *United Provinces Historical Society*، ج ۹، ۲ جولائی ۱۹۳۶ء؛ (۹) بابر کے نام کے تلفّظ پر دیکھیے Abdul Wali: *The Spelling of Babar's name*، در *JASB*، سلسلۂ جدید، ج ۱۴، ۱۹۱۸ء؛ (۱۰) میرزا حیدر دُوغلات: تاریخ رشیدی، انگریزی ترجمہ از E. Denison Ross و N. Elias، طبع لنڈن ۱۸۹۵ء (کوئی فارسی طبع موجود نہیں)، دیکھیے Storey، ۱: ۲۷۴ - ۲۷۵؛ (۱۱) خواند امیر: حبیب السّیر، چاپ سنگی، بمبئی ۱۸۵۷ء، ۳: ۳، ۳۰۴ - ۳۱۰، ۳۲۰ و ۳: ۴، ۶۵ ببعد؛ (۱۳) سید محمد معصوم: تاریخ معصومی، طبع داؤد پوتہ، پونہ ۱۹۳۸ء، بمد اشاریہ، ص ۳۲۴ - ۳۲۵؛ (۱۴) اسکندر منشی: تاریخ عالم آرائے عباسی، چاپ سنگی، تہران ۱۳۱۳-۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۶-۱۸۹۷ء، ۱: ۳۰؛ (۱۵) حَسَنِ رُومْلُو: احسن التواریخ، طبع C. N. Seddon، بڑودہ ۱۹۳۱ء، ص ۴۹ - ۵۱، ۸۶، ۹۱ - ۹۲، ۱۲۷ - ۱۳۰، ۱۶۹ - ۱۷۰، ۱۹۴ - ۱۹۵؛ (۱۶) محمد صالح: شیبانی نامہ، طبع P. M. Melioransky، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۸ء، اشاریہ، ص ۱۰؛ (۱۷) گلبدن بیگم: ہمایوں نامہ اصل اور ترجمہ از As S. Beveridge، لنڈن ۱۹۰۲ء، اشاریہ، ص ۳۰۶؛ (۱۸) نظام الدین احمد: طبقات اکبری، طبع B. De.، Calcutta ۱۹۳۱ء، ۲: ۱ - ۲۷؛ (۱۹) ابوالفضل: اکبر نامہ، کلکتہ ۱۸۷۷ء، فہرست، ص ۴؛ (۲۰) مرزا برخوردار ترکمان: احسن السّیر، دیکھیے سٹوری (Storey)، ۱: ۵۳۵ - ۵۳۶؛ بابر اور شاہ اسمٰعیل صفوی کے روابط پر اور بابر کے مذہب پر دیکھیے (۲۱) حبیب السّیر، ۳: ۴، ۶۵ - ۶۷؛ (۲۲) تاریخ رشیدی (ترجمہ)، ص ۲۴۶، ۲۵۹، ۲۶۱؛ (۲۳) فضل اللہ روز بہاں: سلوک الملوک (ریو (Rieu)، ۲: ۴۸۸، or. ۲۵۳، اوراق ۳ ب تا ۸ ب)؛ (۲۴) احسن التواریخ، ص ۱۲۸؛ (۲۵) فرِشتہ، ۱: ۳۷۲؛ (۲۶) R. S. Poole: *British Museum Catalogue of the Coins of Persia*، لنڈن ۱۸۸۷ء، ص *xxiv* تا *xxix*، ۲۱۰ - ۲۱۱؛ (۲۷) S. Lane-Poole: *British Museum Catalogue of the Coins of the Mughal Emperors*، لنڈن ۱۸۹۲ء، ص ۵ - ۶؛ نیز دیکھیے Sir Richard Burn: *Numismatic Chronicle*، ۱۸، لنڈن ۱۹۳۸ء، ص ۱۷۶ - ۱۷۸، ۱۹۵؛ (۲۸) S. H. Hodiwala:

Historical Studies in Mughal Numismatics، کلکتہ ۱۹۲۳ء؛ بابر کی موت کی کہانی پر دیکھیے: (۲۹) ایس۔آر۔شرما: Studies in Medieval Indian History، پونا ۱۹۵۶ء، ص ۱۵۸ - ۱۶۶؛ (۳۰) W. Erskine: History of India under the First two Sovereigns of the House of Taimur—Baber and Humayun، جلد اول، لنڈن ۱۸۵۴ء؛ (۳۱) لین پول (S. Lane-Poole): Babar، اوکسفرڈ ۱۸۹۹ء؛ (۳۲) L. F. Rushbrook Williams: An Empire Builder of the Sixteenth Century، لنڈن ۱۹۱۸ء؛ (۳۳) S. M. Edwardes: Babur, diarist and despot، لنڈن ۱۹۲۶ء؛ (۳۴) F. Grenard: Baber، پیرس ۱۹۳۰ء؛ (۳۵) Cambridge History of India، طبع Sir Richard Burn: ج ۴، ۱۹۳۷ء، The Mughul Period، باب اول؛ (۳۶) غلام سرور: History of Shah Ismāīl Ṣafawi، علی گڑھ ۱۹۳۹ء، اشاریہ، ص ۱۱۸؛ [(۳۷) Kalikinkar Datta وغیرہ: An Advanced History of India، نیو یارک ۱۹۶۵ء، ص ۴۲۵ببعد مع مآخذ در ص ۶۲۲ ببعد؛ (۳۸) M. A. Hanifi: A Short History of Muslim Rule in Indo-Pakistan، ص ۱۳۸ ببعد؛ (۳۹) بداؤنی: منتخب التواریخ کا اردو ترجمہ از محمود احمد فاروقی، لاہور ۱۹۶۲ء؛ (۴۰) حسین انور: ظہیر الدین بابر، لاہور ۱۹۶۲ء؛ (۴۱) خافی خاں: منتخب اللباب، اردو ترجمہ از محمود احمد فاروقی، کراچی ۱۹۶۳ء، حصۂ اول؛ (۴۲) C. M. Duff: The Chronology of India، لنڈن ۱۸۹۹ء، ص ۲۶۴ ببعد؛ (۴۳) Ishwary Prasad: A Short History of Muslim Rule in India.

(P. HARDY و J. B. HARRISON)

علمی وادبی تصانیف: ۱- بابر نامہ: اپنی اس مشہور ومعروف توزک میں بابر نے چغتائی ترکی زبان میں طفولیت سے لے کر زندگی کے آخری ایّام تک اپنی زندگی کی کہانی بیان کی ہے۔ اس میں اس نے اپنی کمزوریوں اپنی غلطیوں اور شکستوں میں سے کسی چیز کو بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اسے کسی لحاظ سے بھی ''عذر گناہ'' یا صفائی کی کوشش نہیں کہا جا سکتا۔ اس کتاب کا انداز اس قدر سادہ اور بے تکلف ہے کہ اگر کوئی شخص اسے یونہیں اٹھا کر پڑھنے لگے تو اسے کبھی یہ احساس نہ ہو کہ یہ ایک ایسے با تدبیر اور بہادر سپاہی کی توزک ہے جو ایک خاندان کا بانی بھی ہے۔ اس کا اسے اس وقت پتا چلے گا جب وہ اس کا زیادہ گہری نظر سے مطالعہ کرے گا۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس واقعہ نگاری میں بابر اپنے متعلق یا اپنے دوستوں یا اپنے دشمنوں کے متعلق جو کچھ لکھ رہا ہے اس میں کسی جگہ بھی اس نے جانب داری سے کام نہیں لیا؛ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ جب وہ شیبانی خاں ایسے اہم اور قابل انسان کی تنقیص کرنا چاہتا ہے تو توازن کھو بیٹھا ہے۔ لیکن اس طرح کی چند مثالوں کو چھوڑ کر اگر دیکھا جائے تو اس کی توزک (بابر نامہ) اس قسم کی دوسری تصانیف کی سطح سے بہت بلند اور لائق اعتماد ہے۔ بابر کی عمیق قوتِ مشاہدہ اور اس کی قدرت تجزیہ وتحلیل کا ثبوت اس کے ان بیانات اور عبارتوں سے ملتا ہے جن میں اس نے فنی آثار یا کسی جگہ کے جانوروں، پھولوں اور نباتات کے متعلق یا قوموں کی جماعتی نفسیات یا بعض افراد کے کردار کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ بطور ادبی کتاب کے بابر نامہ کی سادہ اور پاکیزہ زبان، اس کا قدرتی اسلوبِ بیان، مناظر قدرت کے ذکر میں اس کی رنگین اور دل آویز عبارتیں بعض ایسے وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہم بابر نامہ کو نہ صرف چغتائی نثر بلکہ عام ترکی نثر کا ایک نفیس ترین نمونہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ [واقعات بابری اس فارسی ترجمے کا نام ہے جو عبدالرحیم خانخاناں نے کیا تھا۔ دیکھیے محمد شفیع لاہوری: سلطان حسین مرزا کے دربار میں علم وہنر کی سرپرستی، در اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۹۳۴ء، ص ۱۳۶].

۲- عروض رسالہ سی: بابر نامہ سے اور بابر کے دیوان کے بعض نسخوں سے نیز بداؤنی کی منتخب التواریخ (کلکتہ ۱۸۶۸ء، ۱: ۳۴۳) سے یہ معلوم تھا کہ بابر نے علم العروض پر چغتائی زبان میں ایک رسالہ لکھا تھا، لیکن ۱۹۲۳ء تک اس رسالے کا سراغ نہ مل سکا تھا۔ اس سال ایم۔ فؤاد کوپرولو (Köprülü) کو پیرس کے ایک مخطوطے میں اس کا ایک نسخہ مثلاً (E. Blochet: Cat. des MSS. turcs، پیرس، Bibl. Nat. Supp.، شمارہ ۱۳۰۸)۔ یہ اس صنف کی دوسری فارسی کی کتابوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اس کی اصلی اہمیت یہ ہے کہ بعض اوزان نظم کے متعلق، جو ترکی شاعروں نے استعمال کیے، اس کی دی ہوئی معلومات نوائی کی میزان الاوزان کی معلومات سے بہت زیادہ ہیں۔ بابر عام طور سے مروّجہ اوزان کے لیے فارسی اور ترکی دونوں زبانوں کی مثالیں پیش کرتا ہے۔ اس میں وہ اپنے اشعار بھی دیتا ہے، لیکن ان اوزان میں جو اس کی اپنی ایجاد ہیں وہ صرف ترکی اشعار پیش کرتا ہے۔ اپنے دیوان کے آخر میں لکھتا ہے کہ عروض رسالہ سی فتح ہندوستان سے دو یا تین سال قبل یعنی ۹۳۲ھ/ ۱۵۲۵ء اور ۹۳۴ھ/ ۱۵۲۸ء کے درمیان پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا.

(۳) مُبَیِّن: (بفتح با و یاے مفتوح مشدّد) بحر خفیف [مخبون] (فاعلاتن مفاعلن فعلن) میں ایک مثنوی۔ عروض رسالہ سی میں ایک حوالے کے مطابق ۹۲۸ھ/ ۱۵۲۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس مثنوی میں حنفی فقہ کے بعض مسائل کا تذکرہ ہے، نیز لشکر کشی کے متعلق بعض معاملات کا۔ اس سیدھے سادے پند نامے کی کوئی خاص فنی اہمیت تو نہیں لیکن اس سے اس امر کا پتا ضرور چلتا ہے کہ بابر کو فقہ سے خاصی دل چسپی تھی اور وہ ایک راسخ العقیدہ حنفی تھا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک مستشرقین اس کو مُبین بروزن مُعیّن پڑھتے تھے۔ A. S. Beveridge نے اسی طرح اس کا تلفظ کیا ہے، اگرچہ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابوالفضل اور بداؤنی نے اس کا نام مُبَیَّن لکھا ہے (نیز یہ کہ شپرنگر نے اس کا نام فقۂ بابُری لکھا ہے)۔ مُبین بروزن مُعین دراصل اس کتاب کی ایک شرح کا نام ہے جو بابر کے صاحب الانشاء شیخ زَین نے لکھی تھی.

(۴) رسالہ والدیہ کا ترجمہ: اصل کتاب (جو صوفی علم اخلاق پر ہے) کے مصنّف خواجہ عبیداللہ احرار[رح] ہیں، جو وسطی ایشیا کے بہت بڑے صوفی تھے اور

جسے سارے تیموری اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے، جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے یہ کتاب خواجہ احرارؒ نے اپنے والد کے ایما سے لکھی تھی۔ بابر نے ۹۳۵ھ/ ۱۵۲۸-۱۵۲۹ء میں اس کا چغتائی زبان میں ترجمہ کیا اور یہ اب اس کے دیوان میں شامل ہے۔ یہ مثنوی بحر رمل (محذوف) (فاعلاتُن فاعلاتُن، فاعلن) میں ہے اور دو سو تینتالیس اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نہایت سادہ اور شگفتہ زبان میں لکھی ہوئی ہے مگر اس میں کوئی ادبی خوبی نہیں۔ اس کی کوئی اہمیت ہے تو یہ کہ اس سے بابر کے صوفیانہ میلانات کا پتا چلتا ہے۔

(۵) دیوان: اس کا بیشتر حصہ ترکی زبان میں ہے۔ لیکن چند ایک نظمیں فارسی میں بھی ہیں۔ اصناف سخن میں سے غزل، رباعی، مثنوی، قطعہ، تیوغ، مُعمّا اور فردیات پر مشتمل ہے۔ اس میں متعدد نظمیں ایسی ہیں جن کا ذکر اس نے بابر نامہ میں کیا ہے۔ دیوان کے جو نسخے اس وقت موجود ہیں وہ عام دواوین کی طرح مرتّب شدہ نہیں، چنانچہ اس میں منظومات کی کوئی خاص ترتیب نہیں۔ فن شعر گوئی کے اعتبار سے بابر پندرھویں صدی کے چغتائی شاعروں میں سے کسی سے بھی — یہاں تک کہ نوائی سے بھی — کم نہیں اور وہ اپنے خیالات و جذبات کو نہایت صاف اور سیدھی زبان میں بیان کرتا ہے جس میں کسی قسم کا تصنّع یا تکلّف نہیں پایا جاتا۔ اس کی شاعری میں صوفیانہ رنگ کے عاشقانہ اور خمریہ اشعار کے ساتھ ساتھ زندگی سے متعلّق عام مضامین بھی ملتے ہیں۔ بعض متقدّم شعرا بالخصوص نوائی کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ لیکن کہیں کورانہ تقلید نہیں ملتی۔ اگرچہ بابر کو صنائع بدائع اور شاعرانہ نکتہ طرازیوں سے بھی دل چسپی تھی (اس کے دیوان میں اس کی انتیس مثالیں موجود ہیں) اور زمانے کے عام ذوق کے پیش نظر اس نے فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں بہت سے ''معمّے'' بھی لکھے (خود اس کے دیوان میں باون معمّے شامل ہیں) تاہم اس کی شاعری کا بیشتر حصّہ ایسا ہے جس میں خلوص اور سچائی ہے اور اس کا انداز بیان سادہ، مانوس اور فطری ہے۔ اس نے بہت سے ''تیُوغ'' (Tuyūgh) بھی لکھے، جو ترکی زبان کی مخصوص صنف نظم ہے، نیز کچھ رباعیات جو بہت دل کش ہیں۔ اس کے تورکو (Türküs) میں، جو بڑی مقبول عوام صنف ہے، ایک نظم موجود ہے، جو مقاطعی (Syllabic) وزن میں ہے (دیکھیے MTM، ۱: ۲۷)۔ وہ فارسی میں بھی شعر گوئی پر قادر تھا (اس کے دیوان میں بیس سے زائد فارسی نظمیں موجود ہیں) لیکن مادری زبان سے اس کی محبت اس بات سے ظاہر ہے کہ اس کے دیوان میں چغتائی زبان میں شاعری کا حصہ غالب ہے۔ مزید براں وہ اپنے اشعار میں اکثر ترکوں کی شجاعت کا ذکر کرتا ہے نیز اس امر کا کہ وہ خود انھیں میں سے ہے۔ اس لحاظ سے وہ اُس ادبی اور ذہنی رجحان کا تتبّع کرتا ہے جس کی ابتدا گزشتہ صدی میں نوائی نے کی تھی اور جو نہ صرف خراسان ہی میں بلکہ تمام تیموری درباروں میں موجود تھا۔ بعد ازاں چغتائی زبان میں لکھنے والے شعرا کا (اس کی اولاد میں، نیز درباریوں میں) اگر ظہور ہوا تو یہ سب بابر کے ادبی اثر کا نتیجہ تھا۔ ادبیّات کا مؤرّخ نوائی کے بعد یقیناً بابر ہی کو چغتائی شعرا میں سب سے بڑا مقام دے گا۔

مآخذ: (۱) بابر نامہ، جسے سب سے پہلے N. Ilminski نے شائع کیا۔ *Babernameh (Diagataice ad fidem codicis petropolitani)*، قازان ۱۸۵۷ء، حیدر آباد کے ایک مخطوطے کا عکس A. S. Beveridge کے بابر نامہ، (*The Babar-nāma*) کی اصل ہے، در وقفیہ گب *GMS*، ۱۹۰۵ء۔ عبدالرحیم خان خاناں نے جو بَیرم خاں [رکّ بآن] کا بیٹا تھا بابر نامہ کا فارسی میں ترجمہ [اکبر کی فرمائش سے] کیا تھا اور اسے J. Leyden اور W. Erskine نے *Mémoirs of Zehir-ed-Din Muhammed Babar*، (لنڈن ۱۸۲۶ء) کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا۔ فرانسیسی زبان میں Pavet de Courteille نے *Mémoires de Baber*، (پیرس ۱۸۷۱ء) کے نام سے ترجمہ کیا اور A. S. Beveridge نے *The Memoirs of Bāber*، کے نام سے۔ ایک اَور نیا ترجمہ ہوا جس میں Leyden اور Erskine کے ۱۸۲۶ء والا ترجمہ بھی شامل ہے، لنڈن ۱۹۱۲ء۔ وہی مصنّف: *The Bābur-nāma in English*، لنڈن ۱۹۲۲ء، دو جلدوں میں اصل کا نہایت شاندار ترجمہ مع مقدمہ و حواشی وغیرہ۔ اس کا دوسرا فارسی ترجمہ حسن پائندہ نے کیا۔ بداؤنی نے لکھا ہے کہ شیخ زین نے بابر نامہ کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، لیکن اس کی واقعات بابری درحقیقت ترجمہ نہیں ہے (اردو ترجمہ از رشید اختر ندوی، بنام تزک بابری، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۶۵ء، ترجمے اور طباعت کی خاصی غلطیاں ہیں)؛ (۲) عروض رسالہ سی: اصل ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ ترکی شاعری کی اصناف کے متعلق اس سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کے لیے دیکھیے محمد فؤاد کوپرُلو کی ترک دلی و ادبیات حقندہ راشتیرمہ لر، استانبول ۱۹۳۴ء، ص ۴۰ - ۴۴؛ (۳) مُبَیِّن: اس کا ایک طویل اقتباس، جو ایک ناقص مخطوطے پر مبنی ہے، I. N. Berezin کی *Turetskaya chrestomatia*، قازان ۱۸۶۷ء، میں شامل ہے۔ اس کے نجی کتب خانے کے ایک مکمّل اور صحیح نسخے (مؤرخہ ۹۳۷ھ/ ۱۵۳۰-۱۵۳۱ء) کے تفصیلی بیان کے لیے دیکھیے کوپرُلو: کتاب مذکور، ص ۲۴۴ - ۲۴۶؛ (۴) رسالۂ والدِیّہ کا ترجمہ: اصل متن دیوان کے نسخۂ مطبوعۂ استانبول کا ملخّص ہے جسے کوپرُلو (Köprülü) نے *MTM*، ۱: ۱۱۳-۱۲۴ میں شائع کیا ہے؛ (۵) دیوان بابر پادشاہ، طبع E. Denison Ross، در *JASB*، ۱۹۱۰ء، میں ایک ناقص رام پوری مخطوطے کا عکس شامل ہے۔ اس وقت صرف اسی ایک مخطوطے کا علم تھا، چند سال بعد ایک زیادہ مکمّل نسخے کا انکشاف ہوا (پیرس، *Bibl. Nat. Suppl. turc.*، شمارہ ۱۲۳۰)، جو A. Samoylovich کے مجموعۂ اشعار بابر پادشاہ، پٹروگراڈ ۱۹۱۷ء، کی اساس و بنیاد ہے۔ کوپرُلو (Köprülü) نے ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء کے *MTM* (شمارہ ۲، ۳، ۴) میں چند مزید نظمیں ایک مخطوطے سے لے کر شائع کیں جو اس وقت استانبول کی یونیورسٹی لائبریری (شمارہ ۳۷۴۳) میں موجود ہے۔ اگرچہ یہ ناقص الآخر ہے تاہم اس کے مندرجات Samoylovich کے مندرجات سے دوچند ہیں۔ اس میں منجملہ دیگر مواد کے ایک سو اٹھارہ غزلیں اور ایک سو چار رباعیات ترکی زبان میں ہیں اور تین غزلیں اور اٹھارہ رباعیات فارسی زبان میں۔

(M. FUAD KÖPRÜLÜ محمد فواد کوپرُلو)

---

* **بابک**: (م ۸۳۸ء) المأمون اور المُعتَصِم (۸۱۳-۸۴۲ء) کے دورِ خلافت میں آذربیجان کی نیم سیاسی نیم مذہبی خُرّمی تحریک [رکّ بہ خرّمیہ] کا سرغنہ۔ یہ تحریک قریبًا رُبع صدی تک جاری رہی اور دنیاے اسلام کے لیے ایک شدید خطرہ بنی رہی۔ مزدکیوں نے، جو ایران میں ساسانیوں کے عہد سے زیرِ قہر و عتاب تھے، اپنی اشتراکی تحریکات مختلف ناموں سے جاری رکھیں۔ دنیاے اسلام کے لیے خطرناک ہونے کے اعتبار سے خروج بابک کو ان تحریکوں میں اہم ترین درجہ دیا جا سکتا ہے۔ خُرّمیہ اپنی خُفیہ سرگرمیوں میں مسلسل مصروف اور ہر وقت بغاوت کے لیے موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ انھیں یہ موقع اضطراب و فتنہ کے اس زمانے میں مل گیا جس کا آغاز امین اور المأمون کی باہمی آویزشوں سے ہوا اَور جس کا سلسلہ المأمون کی فتح (۸۱۳ء) کے بعد تک بھی جاری رہا، اس لیے کہ حسن بن سَہل، والیِ عراق و ایرانِ غربی، کا عہدِ حکومت کمزور تھا پھر یہ ہوا کہ امام علی الرضا کو ولی عہد مقرّر کر دیا گیا تھا۔ جب حاتم، والیِ ارمینیہ نے بغاوت کی تو خُرّمیوں کو خروج کے لیے موقع ہاتھ آیا۔ عرب فوج کے سپہ سالار ہَرثَمہ اور ایرانی وزیر فَضْل بن سَہل کی باہمی رقابت کا انجام یہ ہوا کہ ہرثمہ کو قتل کر دیا گیا۔ جب اس قتل کا حال ہرثمہ کے بیٹے حاتم کو معلوم ہوا تو وہ بَرْذَعَہ سے کِسال کی جانب روانہ ہوا (کسال بَرْذَعَہ سے چالیس فرسخ پر ہے اور تفلیس سے بیس فرسخ پر، دیکھیے البلاذری، ص ۲۰۷) اور اس نے بغاوت کی تیاری مکمّل کر لی۔ اس نے ارمنی سرداروں (بطارقہ) اور رئیسوں اور خُرّمیوں کے قائد بابک کو خط لکھے کہ وہ بھی بغاوت کر دیں۔ اگرچہ انھیں دنوں ہرثمہ کا انتقال ہوا تھا، لیکن بابک نے، جو خوب جانتا تھا کہ اس صورت حال سے کیسے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، ۲۰۱ھ/۸۱۶ء میں بغاوت کر دی (دیکھیے الیعقوبی: تاریخ، طبع ہوتسما (Houtsma)، ۲: ۵۶۳) اور اس نے عساکرِ خلافت کو ۲۲۳ھ/ ۸۳۷ء تک مصروف رکھا۔ المسعودی کی یہ روایت (مروج، طبع Barbier de Meynard، ۷: ۱۳۰) کہ بابک کا اسلامی نام حسن تھا کسی اَور ماخذ میں موجود نہیں۔ الدّینوری، یہ لکھنے کے بعد کہ بابک کے نسب اور مذہب کے متعلق آرا کا اختلاف موجود ہے، کہتا ہے کہ اس کا باپ مُطَہَّر بن فاطمہ بنت ابی مسلم تھا، خُرّمیوں کی شاخ فاطمیّہ اسی فاطمہ سے منسوب ہوئی دیکھیے الاخبار الطِّوال، قاہرہ، ص ۳۷۹؛ اردو ترجمہ لاہور، بہ امداد اشاریہ)۔ اگرچہ اس کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ ابن الزّیّات نے ایک شعر میں (الطبری، طبع ڈخویہ، ۳: ۱۲۳۰) بابک کے لیے ''شیطان خراسان'' کی ترکیب استعمال کی ہے، لیکن اسے فراموش نہ کرنا چاہیے کہ کچھ آگے چل کر (الطبری، ص ۱۳۰۳) یہی شعر ''مازیار'' پر چسپاں کیا گیا ہے۔ ایک حکایت کی رُو سے، جسے الطبری (ص ۱۲۳۲) نے نقل کیا ہے، بابک مَطَر نامی ایک صُعْلُوک (کرائے کے سپاہی) کا ناجائز بچّہ تھا۔ المقدسی کا بیان کم و بیش وہی ہے جو ابن الندیم نے بحوالۂ واقد بن عمرو التمیمی دیا ہے۔ وہ بیان یہ ہے کہ بابک کا باپ اہلِ مدائن میں سے تھا اور پیشے کے لحاظ سے تیلی (دہّان) تھا۔ اس نے آذربیجان کے رستاق مَیمَذ کے ایک گاؤں بِلال آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی اور بابک کی ماں سے، جو ایک نابینا عورت تھی، عقد کر لیا تھا (الفہرست، قاہرہ، ص ۴۸۰ [لائپزگ، ص ۳۴۳]؛ کتاب البدء و التاریخ، Huart کا فرنسیسی ترجمہ، ۶: ۱۱۲)۔ اسی میں یہ بھی مذکور ہے کہ ایک دفعہ اسے نَبَطی گیت گاتے سنا گیا اور یہ کہ وہ اہلِ مدائن سے تھا۔ اس بیان کو نظر انداز کرتے ہوے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان حکایات سے ایک ایسے رجحان کا سراغ ملتا ہے جس کا مقصد بابک کی اصل کو پست ظاہر کرنا ہو۔ بہر حال یہ ناممکن ہے کہ ان حکایات کو کوئی وزن دیا جائے جن میں بغیر کسی سند کے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ بابک کا ایک بھائی بھی تھا۔ فی الحقیقت اگر ہم بابک اور ابن شَرْوِین طبرستانی کے معاملے کو، جس کا الطبری (ص ۱۲۳۱) نے تذکرہ کیا ہے، معتبر تصوّر کریں تو ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ بابک ایک دہقان تھا۔ الدّینوری نے فاطمہ کے بیٹے کا نام مُطَہَّر لکھا ہے۔ اس کا یہ نام اَور کسی ماخذ میں موجود نہیں۔ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ فاطمہ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ وہی مہدی تھا جس کا سیاست نامہ میں ذکر ہے (طبع شِفِر (Schefer)، ص ۲۰۴)، اگرچہ ایسی تصریح کہیں نہیں آئی۔ ابن الندیم اور المقدسی کے بیانات کی رُو سے، جو زیادہ قابلِ اعتماد نظر آتے ہیں، ہم یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ بابک کی پیدائش اور تربیت آذربیجان میں ہوئی۔ انھیں مآخذ کی رُو سے بابک دس سال کی عمر تک اپنی ماں کے پاس رہا جو لوگوں کے بچّوں کو اُجرت پر دودھ پلایا کرتی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر تک وہ تبریز اور اس کے نواح میں مویشی چراتا اور سائیسی کرتا رہا۔ پھر وہ اپنی ماں کے پاس واپس آ گیا۔ ایک دن خُرّمی قائد، جاویدان بن سہرک نے بَذّ جاتے ہوئے بلال آباد میں بابک کو دیکھا اور اس کی صلاحیتوں کو بھانپ کر اسے اس کی ماں سے لے لیا اور اپنے ساتھ لے گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھیں دنوں میں جاویدان اور ابو عمران میں، جو جبالِ بَذّ کے خُرّمیوں کی قیادت کے لیے جاویدان کا رقیب تھا، جنگ ہوئی اور جس میں ابو عمران، جاویدان کے ہاتھوں مارا گیا اور وہ خود بھی نیزے کے زخم سے تین دن کے بعد مر گیا۔ جاویدان کی بیوی نے، جو بابک کے دامِ الفت میں گرفتار تھی، بابک کے لیے خُرّمیوں کی اطاعت ایک افسانہ تراش کر حاصل کر لی؛ وہ یہ کہ اس کے خاوند نے کہا تھا: میری روح میرے بدن سے نکل کر بابک کے بدن میں داخل ہو گی اور اس کی روح میں شریک ہو جائے گی، لہٰذا اس کی اطاعت کرنا لازمی ہے (الفہرست، مطبوعۂ قاہرہ، ص ۴۸۱ و مطبوعۂ لائپزگ، ص ۳۴۴؛ عوفی: جوامع الحکایات، در کتاب خانۂ فاتح، شمارہ ۴۳۰۱، ورق ۱۱۶ الف؛ المقدسی: کتابِ مذکور)۔

بابک کی ابتدائی زندگی افسانویت میں مستور ہے لیکن ۲۰۱ھ/۸۱۶ء کے بعد سے اس کی تمام جزئیات معلوم ہیں۔ بابک نے اس موقع سے جو اسے اس سال حاصل ہوا اَور ان میلانات سے جو اس کے مقلّدین کے قلوب میں ہمیشہ سے جاگزیں تھے استفادہ کر کے علاقے کی مُسلم آبادی پر حملہ کر دیا، ان کی املاک لوٹیں اور ان کی کثیر تعداد کو تہ تیغ کیا حتّٰی کہ عورتوں اور بچوں کو بھی نہ چھوڑا۔ جوں جوں اس کی شہرت، جس کا آغاز یوں ہوا تھا، پھیلی خُرّمیوں کی تعداد بھی، جو جوق

در جُوق اس کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے تھے، بڑھتی چلی گئی۔ ''کورہ'' بَذّ (بعض دفعہ تثنیہ میں: البَذّان) کے مسلمانوں نے مراغہ میں پناہ لی اور اس میں قلعہ بند ہو گئے (المقدسی: کتاب مذکور، ص ۱۱۴؛ البلاذری: فتوح البلدان، طبع ڈخویہ (de Goeje)، ص ۳۳۰)۔ جب بغاوت نے شدّت اختیار کی تو المأمون نے یحییٰ بن مُعاذ الذُّہلی کو ارمِینیہ کا والی مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ بغاوت کا قلع قمع کرے [۲۰۴ھ]۔ جب یحییٰ کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی تو ۲۰۵ھ میں عیسیٰ بن محمد کو اس کی جگہ ارمِینیہ اور آذربیجان کا والی مقرر کیا گیا لیکن بَذّ کے ایک درّے میں اسے اور مقامی رؤسا کو جو اس کے ساتھ تھے شکست ہوئی اور اسے مجبورًا پسپا ہونا پڑا (الیعقوبی، ۳: ۵۶۴)۔ ان ناکامیوں نے مسلمانوں کے خلاف بابک کے تمرّد میں اضافہ کر دیا۔ ۲۰۹ھ میں نئے سپہ سالار، زُرَیق بن علی الاَزْدی کو کسی مؤثر کارروائی نہ کر سکنے کی بنا پر برخاست کر دیا گیا اور اس کی جگہ محمد بن حمید الطوسی کو مقرّر کیا گیا۔ محمد نے پہلے تو زُرَیق کی، جو برخاستگی کی وجہ سے باغی ہو گیا تھا، خبر لی اور پھر ۲۱۴ھ میں اپنا مستقر ہَشتادسر میں قائم کیا، درّہ ہائے بَذّ کا محاصرہ کیا اور کچھ اَور فتوحات بھی حاصل کیں، مگر اصحابِ بابک کے ایک اچانک حملے کی وجہ سے وہ اَور اس کی فوج کے سرداروں کی ایک جماعت اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھی (الیعقوبی، ۲: ۵۶۵؛ سیاست نامہ، ص ۲۰۰)۔ بابک کی ان پے در پے فتوحات سے بعض مقامی ارمنی سرداروں کو، جن میں سَہل بن سُنباط (دیکھیے سطورِ ذیل) بھی تھا، یہ حوصلہ ہوا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے کے لیے بابک کے ساتھ شریک ہو گئے (بَلْعمی، ترجمہ Zotenberg، ۴: ۵۴۲)۔ عبداللہ بن طاہر کو آذربیجان کا والی مقرر کیا گیا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد اسے خراسان بھیج دیا گیا۔ اس کے جانشین مثلاً عُجَیف بن عَنْبَسہ اور علی بن ہشام کمزور تھے، جو ضرورت پڑنے پر بابک سے بھی جا ملتے تھے۔ ان کے باہمی جھگڑوں نے ۲۱۷ھ/ ۸۳۲ء تک صورت حال کو بدتر بنا دیا (الدینوری، ص ۳۹۷؛ الیعقوبی: ۲: ۵۶۶؛ الطبری، ۳: ۱۱۰۸)۔ مزید براں مصالحت کا عارضی وقفہ گزرنے کے بعد بوزنطیوں اور بنو عباس میں دوبارہ جنگ چھڑ گئی، اس پر المأمون بذاتِ خود ایک لشکرِ جرّار لے کر بوزنطیوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے گیا۔ خُرّمیوں نے اس صورتِ حال کو اپنے موافق پایا۔ وہ اٹھے اور اقلیمِ فارس اور اصفہان تک پھیل گئے (دیکھیے سیاست نامہ، ص ۲۰۱)۔

جب المأمون کو اس مہم کے دوران موت نے آلیا تو اس نے ۲۱۸ھ/ ۸۳۳ء میں بمقام طرسوس بسترِ مرگ پر المعتصم کو خُرّمیہ کے متعلق اہم وصیتیں کیں (الطبری، ۳: ۱۱۳۸)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اربابِ حکومت کو خطرے کی شدت کا قوی احساس تھا۔ نئے خلیفہ نے ۲۱۸ھ/ ۸۳۳ء میں اسحٰق بن ابراہیم کی زیرِ قیادت جو افواج بھیجیں انھوں نے خُرّمیوں کو شکست فاش دی۔ اسحٰق بغداد واپس آ گیا [۲۱۹ھ] اور اس کے جانشین ابو سعید محمد بن یوسف نے بابک کے ویران کردہ قلعوں کو دوبارہ تعمیر کیا اور بابک کے سالار معاویہ کو، جو غارت گری کی ایک مہم سے واپس آ رہا تھا، مغلوب کر لیا۔ والیِ [قلعۂ] شاہی و تبریز محمد بن [البُعَیث] نے، جس کا باپ الرّوّاد کے صُعْلُوکوں (کرایہ کے سپاہیوں) میں سے تھا، بابک کے ساتھ مصالحت کی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ خود خرّمی نہ تھا تاہم بعد میں اس نے بابک کے ایک سالار عِصمۃ الکردی صاحب مرند [برْزَند] کو گرفتار کر لیا اور خلیفہ کا طرفدار بن گیا (الطبری، ص ۱۱۷۱؛ بلعمی، طبع Zotenberg، ۴: ۵۲۶؛ الیعقوبی، ۲: ۵۶۸)۔ خرمیوں کے خلاف گو چند ایسی مقامی کامیابیاں حاصل کر لی گئی تھیں تاہم اس بغاوت کی توسیع کا انسداد ابھی نہیں ہوا تھا۔

۲۲۰ھ/ ۸۳۰ء [کذا ۸۳۵ء] میں المُعتصم نے افشین [رک بآن] کو، جو مصری بغاوتوں (الیعقوبی: موضع مذکور) کو فرو کرنے میں بڑا نام پیدا کر چکا تھا بابک کے استیصال کے لیے مامور کیا۔ افشین نے اپنا مستقر بَرْزَند میں قائم کیا اور اپنے آپ کو صرف فوجی تیاریوں اور حربی حرکات کی تنظیم ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ متعدد اَور اقدامات بھی عمل میں لایا، مثلاً اس نے خود بابک کے مخبروں کو گرفتار کر لیا۔ دوسری دفعہ فوجیں بُغا الکبیر کی زیرِ قیادت بھیجی گئیں (بُغا خلیفہ کی بھرتی کی ہوئی ترکی فوج کے سالاروں میں سے تھا)۔ بابک نے ان پر ناگہانی حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ اس حملے کی خبر ایک جاسوس نے پہلے ہی کر دی تھی اَرْشَق (دیکھیے جغرافیاے مفصل ایران، ۲: ۲۳) میں بابک اور اس کی فوج کو شکست فاش ہوئی۔ بابک مُوقان کے رستے سے بَذّ کی طرف بھاگ گیا (الطبری، ص ۱۱۷۴ بعد)، افشین، جو جوسادارُسب تک بڑھ آیا تھا، سال بھر خرّمیوں سے لڑتا بھڑتا رہا، آخر جاڑے کی شدت سے مجبور ہو کر برزند کی جانب پسپا ہو گیا (الیعقوبی، ص ۵۷۸)۔ ۲۲۱ھ میں افشین اور بُغا نے بَذّ کی طرف پیش قدمی کی۔ افشین نے دَرْواز میں ڈیرے ڈالے اور بُغا نے ہشتادسر میں۔ بُغا کی افواج کے نقصانات کی تلافی کے لیے، افشین نے اپنے بھائی فضل بن کاوس کو، تھوڑی فوج کے ساتھ، اس کے پاس بھیج دیا۔ موسم سرما کی شدّت سے بُغا واپس ہو گیا، لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ افشین ابھی برسرِ پیکار ہے تو وہ بھی دوبارہ حرب و ضرب میں مصروف ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب اسے معلوم ہوا کہ بابک کے حملوں کی وجہ سے افشین واپس چلا گیا ہے تو اس نے بھی پسپائی کا ارادہ کر لیا۔ واپسی کے دوران میں اس کی فوج کا ایک کثیر حصّہ بابک کے ایک شب خون کی نذر ہو گیا اور وہ بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگا (بلعمی، ص ۵۲۸؛ الطبری ۳: ۱۱۸۶-۱۱۹۳)۔

اس موسم سرما میں ہشتادسر کے مقام پر تُرک کے ہاتھوں (جو اسحٰق بن ابراہیم کا مولیٰ تھا)، بابک کے مشہور سالار طَرخان کا قتل بابک کے لیے ایک صدمۂ عظیم تھا (الطبری، ص ۱۱۹۴)۔ ۲۲۲ھ میں، افشین نے کمک حاصل کر کے، ایک عام حملے کا اقدام کیا اور آذِین شکست کھا کر بَذّ کی طرف بھاگا (بلعمی، ص ۵۳۱)۔ اس مرحلے پر، مسلم مآخذ کے مطابق بابک نے اپنے اُوپر سے دباؤ کم کرنے کے لیے، بوزنطی شہنشاہ تَوفِیل (Theuphilus) بن میخائیل کو خط لکھا کہ چونکہ خلیفہ کے تمام عساکر اس کے خلاف جنگ میں مصروف ہیں، ارضِ خلافت

پر حملے کا یہ موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے، چنانچہ شہنشاہ طرطوس تک بڑھ آیا۔ اس نے قلعۂ زِبَطُرہ پر قبضہ کرلیا (قب الطبری، ۳: ۱۲۳۴-۱۲۵۶، قب A. Vasiliev: *Histoire de L' Empire*، ۱: ۳۶۴)، اگرچہ H. Sadighi: *Les Mouvements religieux iraniens*، ص ۲۵۷ نے اس حکایت کو مشتبہ قرار دیا ہے، کیونکہ بوزنطی حملہ بابک کی شکست کے بعد وقوع پذیر ہوا اور اس وجہ سے بھی کہ بوزنطی مآخذ اس موضوع پر بالکل خاموش ہیں، لیکن بوزنطیوں کے ساتھ خرّمیوں کے تعلّقات، حالات کی سازگاری کے وقت سیاسی صورت حال سے استفادے کی قابلیت جو بابک میں تھی اور بوزنطی مؤرّخین Cedrenus (۲: ۱۱۹) اور Theophances (ص ۱۰۹، ۶۲۵) کے ان تعلقات کے متعلق بیانات (دیکھیے Weil: *Gesch. der Chalifen*، ۲: ۲۴۰) یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس نوعیت کا کوئی اقدام بالکل ممکن ہے کہ ہوا ہو۔ انتظار کے طویل عرصے نے، جو درمیان میں آ پڑا، عسکریوں میں ایسی [غلط] افواہوں کو ہوا دی کہ افشین خفیہ طور پر بابک کے ساتھ ساز باز کر چکا ہے۔ بالآخر جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو افواج نے بذّ کی طرف پیش قدمی کی اور بابک کو راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ بابک نے پانچ افراد کے ساتھ دریاے اِرَس عبور کیا اور اقلیم اَرّان میں پناہ لی۔ افشین بَذّ میں داخل ہوا اور وہ خونریز معرکے کے جو اس کے بعد ہوے ان میں خرّمیوں کی ایک کثیر تعداد تہ تیغ کر دی گئی اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ اسیرانِ جنگ میں بابک کی کئی بیویاں اور بچے بھی تھے۔ (الیعقوبی، ۲: ۵۷۹؛ الطبری، ص ۱۲۳۳) اس کی ایک لڑکی معتصم کے حرم میں داخل کر دی گئی (سیاست نامہ، ص ۲۰۴)۔ افشین نے وُلاۃِ آذربیجان اور سردارانِ آرمینیہ کو اطلاعات بھجوا دیں کہ بابک فرار ہو گیا ہے اور حکم دیا کہ اسے گرفتار کرکے اس کے سامنے حاضر کیا جائے۔ آخرکار بابک کو جب وہ اپنے بھائی عبداللہ کے ساتھ پہاڑوں میں مارا مارا پھر رہا تھا ایک کسان نے شناخت کر لیا۔ اس امر کی اطلاع سَہْل بن سُنباط والی ارّان کو دی گئی (المسعودی: مُروج، ۷: ۱۲۴)۔ سَہْل نے، جو کسی وقت بابک کی اعانت کیا کرتا تھا، خلیفہ کی نگاہ میں اس سے بری ہونے کے لیے بابک کو ترغیب دی کہ وہ روم کی طرف نہ جائے اور اُسے شکار کے بہانے لے جا کر افشین کے حوالے کر دیا۔ Streck: *Armenie*، [آ]، لائڈن، ۱: ۴۳۸ اور J. D. Morgan: *Hist. du peuple armenien*، ص ۱۳۳، میں سَہْل بن سُنْباط کو سنباط بن آشُوط (م ۲۷۷ھ/ ۸۹۰ء) کے ساتھ ملتبس کر دیا گیا ہے۔ صفر ۲۲۳ھ میں افشین بابک کو ساتھ لے کر سامرّا میں ایک فاتحانہ جلوس کے ساتھ داخل ہوا۔ اس زمانے کی رسم کے مطابق، عالم اسلامی کے اس مہیب دشمن کو تشہیر کے لیے ہاتھی پر سوار کیا گیا اور پیادہ اور سوار فوج کی قطاروں میں سے گزار کر اُسے خلیفہ کے حضور میں لایا گیا (الطبری، ص ۱۲۳۰؛ الیعقوبی، ص ۵۷۹؛ المسعودی، ۷: ۱۲۷)۔ معاصر شعرا نے اس یوم سعید کی تہنیت میں نظمیں پڑھیں اور اسلام کے راستے میں خدمات انجام دینے والے سالاروں کی مدح میں قصیدے لکھے۔ بابک کو اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر قتل کیا گیا اور اس کا سر خراسان بھیجا گیا اور مختلف شہروں میں دکھایا گیا اور اس کا دھڑ سامرّا کے ایک دُوردست محلّے میں سولی پر لٹکا دیا گیا۔ اس کے ایک صدی بعد بھی گو سامرّا اجڑ چکا تھا، اس جگہ کو ابھی تک خَشَبۃ البابک (= بابک کی سولی، مروج، ۷: ۱۲۸) ہی کہا جاتا تھا۔ خُرّمی، جو بابک کی موت کے بعد کم زور ہو گئے تھے، بعدازاں وقتاً فوقتاً بغاوتیں کرتے رہے (الطّبری، ص ۱۳۵۱؛ المسعودی: کتاب التنبیہ، *BGA*، ۸: ۳۵۵؛ سیاست نامہ، ص ۲۰۴) لیکن ان میں سے بعض بالآخر مسلمان ہو گئے اور باقیوں نے قرامطی اور اسمٰعیلی فرقوں میں شمولیت اختیار کر لی۔

بابک کی سیرت اس کی بیس سالہ جنگ جوئی سے ظاہر ہوتی ہے، مضبوط ارادے، صلابت اور عزم صمیم کا مالک تھا۔ اس کی صلابت کے ثبوت کے لیے یہ بیان کر دینا چاہیے (المقدسی، متن، ۶: ۱۱۸ [ترجمہ، ص ۱۱۵]؛ سیاست نامہ ص ۲۰۳؛ العَوفی، ص ۱۵۴) کہ اس کے قتل کے وقت، جب اس کا ایک بازو کٹ چکا تھا، اس نے وہ خون جو اس کے جسم سے رواں تھا اپنے چہرے پر مل لیا، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اس کا چہرہ، موت، جس کی سُرخی عنقریب اس سے چھِننے والی تھی، کے خوف سے زرد نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے بے حد دولت فراہم کر لی تھی۔ بذّ میں شاہانہ شان و شوکت سے زندگی بسر کرتا تھا اور اپنے حرم کی بے شمار عورتوں کے ساتھ مے نوشی اور راگ رنگ کی مجلسیں منعقد کیا کرتا تھا۔ لفظ خُرّم، جسے مسلم مصنّفین نے مسرّت اور ہر قسم کی شہوانی بے راہ روی کے معنے دیے ہیں، اسی نوعیت کی زندگی کا ایک نشان بن گیا۔ بذّ (مدینۃ البابک) سے اسے جو بے پناہ محبت تھی اس کا اظہار اس نے اپنے قتل کے دوران میں بھی کیا اس کی آخری خواہش یہ تھی کہ وہ شبِ ماہتاب میں اس جگہ کا نظارہ کرے۔ وہ گفتگو جو اس نے سَہل بن سُنباط سے کی اور جس کا مفاد یہ تھا کہ اگر اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کے بھائی عبداللہ کو اس کا کام جاری رکھنے کے لیے کسی اَور جگہ بھیج دیا جائے اور وہی اس کے مقلّدین کا قائد ہو (بلعمی، ۴: ۵۴۳) اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کے ارادے عیاں ہوتے ہیں۔

مسلم مآخذ کے مندرجات، ایک تقابلی تجزیے کے بعد، متّبعین بابک کے عقائد پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔ بابک کے متّبعین کی اپنی کوئی تصنیف اب تک نہیں ملی، نہ بابک سے پہلے کے خرّمیوں کے متعلق عموماً کوئی ایسا ماخذ موجود ہے اور نہ بابک کے متّبعین کے عقائد کے متعلق خصوصاً کوئی چیز ملتی ہے۔ پس فرقۂ بابکیّہ کا مطالعہ خرّمیہ کے حدود و دوائر کے اندر ہی رہ کر کرنا چاہیے۔ لفظ خُرّم سے، جو اس کے اپنے لقب بابک الخرّمی میں موجود ہے، اور اس کے فرقے کے نام خُرّمیّۃ البابکیۃ سے یہ بات صاف طور پر عیاں ہے۔ ابن الندیم نے خُرّمیہ کو دو صنفوں میں تقسیم کیا ہے، مُحَمّرہ اور بابکیّہ (ص ۳۴۹، مطبوعۂ لائپزگ، ص ۳۴۲)۔ عبدالقاہر بن طاہر البغدادی کا خیال ہے کہ مُحمّرہ (سُرخ پوش) بابکیّہ اور مازیاریہ پر مشتمل ہیں (الفَرْقُ بین الفِرق، قاہرہ، ص ۲۵۱)۔ ابن حزم کہتا ہے کہ

خُرّمیہ (اصحاب بابک) مزدکی فرقوں میں سے ایک فرقہ ہیں (الفِصل فی الملل والاھواء والنحل، قاہرہ، ۱: ۳۴)۔ سبط ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ بابک مانی اور مزدک کے ثنوی فرقے سے تھا (مرآۃ الزمان، Bibl. Nat. f. arab، ۱۹۰۵، ورق ۱۱۰ الف)۔ بقول حمد اللہ المستوفی، بابک مزدکیّت کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتا تھا (تاریخ گزیدہ، طبع وقفیۂ گب، ص ۳۱۶)۔ لیکن یہ باور کرنا مشکل ہے کہ مصنّفین کا مقصد اصطلاح ''بابکیّہ'' (سابق جاودانیہ) کے استعمال سے خُرّمیوں کے اندر اعتقادی اختلافات کی موجودگی کو ظاہر کرنا تھا۔ بہر حال بعض ایسے مآخذ کا ذکر یہاں ضروری ہے جو ان کے مذہبی معتقدات کے متعلق اہمیّت رکھتے ہیں۔ بابک کی اصل کے متعلق حکایات ظاہر کرتی ہیں کہ بابکی عقیدۂ تناسخِ ارواح کے قائل تھے (رک بہ المقدسی: کتاب مذکور، ج ۴، ترجمہ: ص ۲۸، متن: ص ۳۰)۔ المقدسی کا یہ بیان (کتاب مذکور، ص ۸) کہ اس کے پیرو اسے نبی مانتے تھے (ابن الندیم، مطبوعۂ قاہرہ، ص ۴۸۰، طبع فلوگل، ص ۳۴۲) کے اس بیان کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہے کہ وہ دعویِ الوہیت کرتا تھا۔ المقدسی کی مہیا کردہ اطلاع سے خُرّمیہ کے اعتقاد کی حقیقت زیادہ صاف طور پر نظر آتی ہے یعنی یہ کہ دنیا میں ہر وقت ایک نبی موجود رہے گا (ایسا ہی بعض غالی فرقوں کا بھی عقیدہ ہے) اور یہ کہ نبوت کا منصب انتقال موروثی ہے یا عمل تناسخ کے ذریعے منتقل ہوتا رہتا ہے۔

ابن الندیم کا یہ بیان کہ قتل وغصب وحرب ومُثلہ کی طرف خُرّمیہ کا رجحان بابک کی وجہ سے ہوا غلط ہے۔ یہ معلوم ہے کہ عربوں کی ترکتاز کے خلاف انھوں نے ہمیشہ گہری رنجش اور نفرت وحقارت محسوس کی اور جب کبھی انھیں موقع ملتا وہ حصولِ قوت کے لیے بغاوت کر دیتے تھے، یہ بھی معلوم ہے کہ عہدِ ساسانیہ میں ان کے پیشرو، مزدکیہ، نے بھی حکومت اور امرا کے خلاف اسی جذبے کا اظہار کیا تھا۔ لہٰذا اس مفروضے کے لیے کوئی وجہ موجود نہیں کہ بابک کے ایک لاکھ مسلمانوں کو قتل کرنے کی کہانیاں (قب الطبری، ص ۱۲۳۳؛ سیاست نامہ، ص ۲۰۳؛ المقدسی، ص ۱۱۴؛ المسعودی: التنبیہ، ص ۴۵۲) بے حد مبالغہ آمیز ہیں۔ ابن الندیم کا بیان ہے کہ جب بابک خُرّمیہ کا سردار بنا تو اُنھوں نے ایک گائے کی قربانی دی، اس کی کھال بچھائی، طشت میں شراب بھر کر اس میں روٹی کے ٹکڑے ڈالے، ہر شخص نے کھال کو پاؤں سے روند کر ایک ٹکڑا اس شراب میں بھگو کر کھایا اور بابک کے ہاتھ کو بوسہ دے کر اس کی اطاعت کا حلف اٹھایا۔ پھر انھیں کھانا اور شراب پیش کی گئی۔ یہ معلومات اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان سے پتا چلتا ہے کہ ایک نئے سردار کے گدی پر بیٹھنے کے وقت کیا رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ خُرّمیہ کے جملہ طبقات میں اور مزدکیہ کے باہمی اِرتباط کے پیشِ نظر ان اطلاعات کو درست ہی سمجھنا چاہیے کہ وہ عورتوں اور مردوں کی مخلوط مجالسِ شراب وطرب منعقد کرتے تھے اور ان کے ہاں نکاح باجماعت کا رواج تھا۔ سیاست نامہ (ص ۲۰۴) کے مطابق خُرّمیہ کا جب کوئی مجمع ہوتا یا وہ کسی مہم کے لیے بیٹھتے تو پہلے وہ ابومسلم پر 'درود' بھیجتے، اس کے بعد اس کی لڑکی فاطمہ کے بیٹے مہدی اور فیروز پر [بہ تصرّف، یہ در اصل (المقدسی، متن، ۴: ۳۰) مہدی بن فیروز پر درود بھیجنے کا ذکر ہے بجائے مہدی اور فیروز کے]۔ خُرّمیہ اور مزدکیہ کے درمیان ربط اور وہ طرزِ عمل جو بابک نے ایرانی مسلمانوں کے متعلق اختیار کیا یہ دونوں باتیں اس سے مانع ہیں کہ ہم بابک کے رویّے کو ایک خاص گروہ کے مفاد کی پاس داری کے بجائے ایرانی قوم پرستی کا مظہر قرار دیں۔ یہ واقعہ کہ وہ اسلامی عَلَم لیے پھرتے تھے اس وجہ سے تھا کہ جب کبھی وہ مرکزی حکومت کے مقابلے میں کم زور ہوتے تھے تو وہ اپنے عقائد کو مخفی رکھ کر اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کرتے تھے۔ اسی نوع کا طرزِ عمل بعد میں آنے والے ایران کے بعض فرقوں کی امتیازی خصوصیت ہو گیا۔ متاخّر کتابوں میں اس کا ذکر بھی ایران میں پیدا ہونے والی دیگر مذہبی تحریکات کے ذیل میں کیا گیا ہے۔ یہ کیوں؟ اس کے سمجھنے کے لیے ان وسیع معانی پر غور کرنا چاہیے جو بعد کے زمانے میں اس اصطلاح کو پہنائے گئے۔

مآخذ: علاوہ ان تصانیف کے جن کا متن میں ذکر ہے دیکھیے: (۱) ابن قتیبہ: کتاب المعارف (طبع وُسٹنفِلڈ، گوٹنجن ۱۸۵۰ء)، ص ۱۹۸؛ (۲) ابن الاثیر (طبع تورنبورغ Tornberg)، ۶: ۳۱۵، ۳۳۹؛ (۳) ابوالفرج: مختصر الدُوَل (بیروت ۱۸۹۰ء)، ص ۲۴۱ ببعد؛ (۴) ابن خلدون: العِبَر (بولاق ۱۸۶۷ء)، ۳: ۲۵۶-۲۶۲؛ (۵) روضۃ الصفاء، بمبئی، ۳: ۱۴۶ ببعد؛ (۶) منجّم باشی (ترجمہ، ۲: ۱۲۹)؛ (۷) G. Weil: *Geschichte der chalifen*، Manheim ۱۸۴۸ء)، ۲: ۲۳۵-۲۴۰؛ (۸) G. Flügel، در *ZDMG*، ۲۳: ۵۳۱؛ (۹) Müller: *Der Islam im Morgen-und Abendland* (برلن ۱۸۸۵ء)، ۱: ۵۰۸؛ (۱۰) W. Muir: *The Caliphate* (ایڈنبرا ۱۹۱۵ء)، ص ۵۰۴، ۵۱۴؛ (۱۱) E. Blochet: *Le Messianisme dans L' hetevodoxie Musul-mane* (پیرس ۱۹۰۳ء)، ص ۴۶ ببعد؛ (۱۲) Sadighi: *Les mouvements rebigieux iraniens* (پیرس ۱۹۳۸ء).

(OSMAN TURAN، از آ، ترکی)

بابِل: قدیم عرب مصنّفین نے بابل شہر (Babylon) اور بابل کے ملک (Babylonia) دونوں کو بابل ہی کہا ہے۔ اس شہر کے کھنڈرات بغداد سے کوئی چوّن میل کے فاصلے پر بغداد-ہِلّہ شاہ راہ پر ملتے ہیں۔ مگر ملک کی حدود کے تشخّص کے بارے میں ان مصنّفین میں اختلاف رائے ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا؛ بعض کے خیال میں اس کا رقبہ بہت کم تھا۔ مسلم مُؤرّخوں اور جغرافیہ نویسوں کی رائے میں بابل کا شہر اسلامی فتوحات سے بہت عرصے پیشتر ہی ویران وبرباد ہو چکا تھا اور اس وقت اس کی جگہ بابل نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہی موجود تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ گاؤں عباسی عہد یعنی چوتھی/دسویں صدی تک بھی موجود تھا، مثلاً ابن حَوقل بھی اپنے زمانے میں اس کی موجودگی کا ذکر کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ''اس کی عمارتیں عراق بھر میں سب سے قدیم خیال کی

جاتی تھیں اور یہ شہر بادشاہوں نے آباد کیا اور اسے اپنا پایۂ تخت بنایا تھا اور ان کے جانشینوں نے بھی اسے برقرار رکھا۔ اس کی شاندار عمارتوں کے کھنڈر اب بھی اپنی عظمتِ رفتہ کے ثنا خواں ہیں''۔

ابوالفداء، جس نے ابن حوقل کا یہ اقتباس نقل کیا ہے، اس پر یہ اضافہ کرتا ہے ''یہی وہ شہر ہے جہاں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبیّنا و علیہ الصلوٰۃ والسلام اور نارِ نمرود کا واقعہ پیش آیا۔ اور ان دنوں وہاں کھنڈروں کے سوا کچھ نہیں، ہاں ان کھنڈروں پر ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے۔

ساتویں/تیرھویں صدی میں القزوینی نے بابل کے کھنڈروں کا تذکرہ کیا ہے کہ لوگ اپنے مکانوں کے لیے اس کے کھنڈروں میں سے اینٹیں نکال نکال کر لے جاتے رہے ہیں۔ بلکہ یہ سلسلہ کچھ پیچھے تک بھی برابر جاری تھا۔ اس ضمن میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ''بابل ایک گاؤں کا نام ہے، جو قدیم ایّام میں عراق میں دریائے فرات کی کسی ایک شاخ کے کنارے آباد تھا۔ اب لوگ اس کے کھنڈروں میں سے اینٹیں نکال نکال کر لیے جا رہے ہیں۔ وہاں دانیال کا ایک زیر زمین محبس (Dungeon) بھی موجود ہے، جہاں یہودی اور نصرانی بعض مقررہ تہواروں کے موقع پر زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہی گڑھا ''ہاروت و ماروت کا کنواں'' تھا۔

البکری بابل کے مینار کا ذکر کرتا ہے اور اسے ''المُجْدَل'' (Al-Madjal) کا نام دیتا ہے۔ متقدّمین کی تقلید کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ یہ مینار (جسے عہدِ حاضر کے ماہرینِ آثار نے Ziggurat تشخیص کیا ہے) بابل میں نمرود نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ پانچ ہزار مکعّب (ساڑھے سات ہزار) فٹ بلند تھا اور یہ وہی مینار ہے جس کی طرف قرآن مجید کی سورۃ النحل (۱۶: ۲۶) میں بدیں الفاظ اشارہ پایا جاتا ہے: قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ (ان سے پہلے جو گزر چکے ہیں انھوں نے بھی (دعوتِ حق کے خلاف) تدبیریں کی تھیں (کیا نتیجہ نکلا؟) انھوں نے (اپنی تدبیروں کی) جو عمارت بنائی تھی اللہ نے اس کی بنیاد کی اینٹیں تک ہلا دیں۔ پس ان کے اوپر (انھیں کی بنائی ہوئی) چھت آ گری اور ایسی راہ سے عذاب نمودار ہوا جس کا انھیں وہم و گمان بھی نہ تھا)۔

مسلم مصنّفین میں بابل (Babylon) کی تاریخ اور اس کی حقیقت و اصلیّت سے متعلق بہت زیادہ اختلاف رہا ہے۔ بہرکیف یاقوت الحموی نے ان تمام مختلف خیالات و روایات کا سادہ ملخّص پیش کر دیا ہے جو اس شہر کے متعلّق مسلمانوں میں رائج و مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام نے طوفانِ نوح کے بعد اس شہر کو آباد کیا اور خود اس میں بسے۔ ایرانیوں کا دعوٰی (جیسا کہ یزدجرد بن مہماندار نے لکھا ہے) یہ ہے کہ بادشاہ ضحّاک پہلا شخص تھا جس نے اس شہر کو بسایا۔ ابن الکلبی کا بیان ہے کہ اس شہر کا رقبہ ۱۲x۱۳ فرسخ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دریائے فرات اس کی فصیل سے ٹکراتا تھا، تا آنکہ اسے بُخت نصر نے اس کے موجودہ رخ پر پھیر دیا مبادا کسی وقت یہ شہر پناہ کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ بابل کا شہر برابر آباد و پُررونق رہا، تا آنکہ سکندر کے ہاتھوں برباد ہوا۔ بابل کی تاریخ اور ثقافت و تہذیب اور اس کی تباہی کے بعد کے حالات کے متعلّق جس قدر قدیم معلومات ملتی ہیں بہت متضاد اور الجھی ہوئی ہیں، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر کوئی خاص قابلِ اعتماد یا مستند مواد موجود نہ تھا۔ اگر کچھ تھا تو وہ محوّلہ واقعات سے متعلّق تورات کے کچھ حوالے تھے یا بعض قدیم یونانی مؤرخوں کے بیانات، یا ایسی داستانیں اور روایتیں تھیں جو کم علم لوگوں میں چلی آتی تھیں۔

اس شہر سے متعلّق اصل اور صحیح واقعات اس وقت سامنے آئے جب انیسویں صدی کے اوائل میں آثار قدیمہ کے محقّق اس کے کھنڈروں تک پہنچے۔ انھوں نے بہت سے تبرّکات اور مصنوعات برآمد کیں، جن میں خط میخی میں لکھی ہوئی بعض الواح تھیں۔ ان سے اس شہر کے متعلّق صحیح صحیح معلومات کو عملاً مرتب کیا جا سکا۔ ان سے تمام پرانی کہانیوں اور داستانوں کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔ ان فرضی داستانوں کے بجائے اب ہمارے پاس صحیح اور ٹھیک معلومات جمع ہو گئی ہیں، جو یورپ کی مختلف زبانوں میں متعدد کتابوں میں موجود ہیں (نیز رکّ بہ بارفروش)۔

مآخذ: (۱) الطبری، ۱: ۲۲۹ و ۲: ۷۷ ۲، ۱۰۵۶؛ (۲) ابن الأثیر، ۲: ۳۰۷، ۳۹۵، ۳۹۷، ۳۹۸، ۴۰۰، ۴۰۱ و ۴: ۳۵۱، ۳۷۲ و ۵: ۴۳۸، ۴۳۹؛ (۳) الیعقوبی، ۱: ۲۳۵، ۳۲۱؛ (۴) المسعودی، مروج، ۲: ۱۸۶؛ (۵) وہی مصنّف: التنبیہ، ص ۳۵؛ (۶) الأصطخری، ص ۱۰؛ (۷) ابن حَوْقل، ص ۳۴۴؛ (۸) ابوالفداء: تقویم، ص ۳۰۳؛ (۹) القزوینی: آثار، ص ۲۰۲؛ (۱۰) البکری، (طبع السقّا)، ۱: ۲۱۸؛ (۱۱) یاقوت، بذیل مادّۂ بابل؛ (۱۲) ابن عبدالحق: مراصد [الاطلاع]، قاہرہ ۱۹۵۴ء، ۱: ۱۴۵؛ (۱۳) البیرونی، صفة المعمورة (طبع طوغان Togan)، ص ۲۳؛ (۱۴) G. Awad: آثار العراق، در *Sumer*، ۵، ۱۹۴۹ء، ۲: ۷۲-۷۳؛ (۱۵) R. Koldewey: *The Excavations at Babylon* (ترجمۂ A. S. Johns، لنڈن ۱۹۱۴ء)؛ (۱۶) A. H. Layard: *Discoveries in the ruins of Nineveh and Babylon*، لنڈن ۱۸۵۳ء؛ (۱۷) S. Lloyd: *Ruined cities of Irak*، اوکسفرڈ ۱۹۴۲ء، ص ۱۱-۲۰؛ (۱۸) A. Parrot: *The Tower of Babil* (مترجمۂ E. Hudson)، لنڈن ۱۹۵۵ء؛ (۱۹) C. J. Rich: *Memoirs on the Ruins of Ancient Babylon*، لنڈن ۱۹۱۸ء؛ (۲۰) E. Unger: *Babylon*، (*Reallexikon der Assyriologie*)، ۱: ۳۶۹-۳۳۰۔

(G. AWAD)

بابلیُون: (Babylon) مصر کا ایک شہر۔ بابلیون کا نام موجودہ قاہرہ✱ کے قرب و جوار میں قرونِ وسطٰی کے ایک مصری شہر کی نشان دہی کرتا ہے۔ Casanova کے بیان کے مطابق یہ قدیم مصری Pi-Hapi-n-On کی یونانی شکل ہے، جو ایشیائی βαβυλὼν میں مدغم ہو کر آیا، جس سے یونانی بہت زیادہ

مانوس تھے۔ یہ لغوی تحقیق اعتراضات سے مبرّا نہیں۔ لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس لفظ میں مصر کے کسی نہ کسی مقام کا نام ضرور موجود ہے۔ اس نام سے یونانیوں کا کوئی نہ کوئی شہر اور قلعہ مراد ہے، جو بالائی اور نشیبی مصر کی سرحدوں پر واقع تھا اور تمام اندرون ملک پر فرماں روائی کرتا تھا۔ اس وقت بھی قدیم قلعے کے چند حصّے بچے کھچے قصر الشّمع میں موجود ہیں۔ بابلیون (Babylon) کا محلّ وقوع قدیم ایّام میں مناسب و موزوں تھا اور اس کی اہمیّت بہت زیادہ تھی، کیونکہ دریاے نیل ان دنوں مشرق میں زیادہ ہٹ کر بہتا تھا۔ حضرت عمروؓ [بن العاص] کی تسخیر مصر کے وقت جملہ فیصلہ کن جنگیں یہیں لڑی گئی تھیں۔ بابلیون کی تسخیر (۲۱ ربیع الآخر ۲۰ھ/۹ اپریل ۶۴۱ء) سے مصر کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا۔ مسلمانوں کا فوجی کیمپ، جو بعد میں ترقّی کر کے "فُسطاط مصر" کے نام سے ایک شہر بن گیا، اس وقت اسی مقام کے قریب نصب کیا گیا تھا جو فوجی زاویۂ نگاہ سے اہم تھا اور پرانے قلعے کے کھنڈر اسی شہر کی تعمیر میں صرف کیے گئے تھے۔ جہاں تک بَرْدی مخطوطات سے ہمیں پتا چلتا ہے پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے آخر تک فُسطاط اور بابلیون میں فرق و امتیاز نمایاں تھا۔ فسطاط میں مہاجرین اقامت گزین تھے، جہاں ان کے حدود (خِطط) کو نشان لگا کر جدا کر دیا گیا تھا۔ بابلیون میں غلّے کے تاجر اور اربابِ حکومت رہتے تھے۔ جزیرۂ روضہ پر اسلحہ کے میگزین کا، جس کا ذکر بردی مخطوطات میں ملتا ہے، قلعے سے بہت گہرا تعلق تھا۔ مگر فسطاط اور بابلیون کا ابتدائی امتیاز بہت جلد فراموش ہوگیا۔ بابلیون کا لفظ عربوں میں متروک ہوگیا اور صرف قبطیوں میں باقی رہ گیا۔ قبطیوں نے اس کے استعمال کو بہت زیادہ وسعت دے دی کیونکہ وہ بسا اوقات بابلیون کا اطلاق بستیوں کے اس سارے سلسلے پر کرتے تھے جو قصر الشّمع سے شروع ہو کر اور فُسطاط و قاہرہ سے گزرتا ہوا Maṭariyye-Heliopolis تک چلا گیا تھا۔ یہی استعمال مغربی مصنّفین میں رواج پا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بابلیون (Babylonia) مصر اور دُول مغربی کے مابین متعدّد معاہدوں میں، جو لاطینی میں لکھے گئے تھے اور جنھیں Amari نے شائع کر دیا ہے، املا کی مختلف صورتوں میں، قاہرہ کے نام کے طور پر مندرج ہے۔ یہ نام اس وقت کے یورپی لٹریچر اور منشوروں میں بھی ملتا ہے، مثلاً Mandeville اور Boccaccio کے سیاحت نامے میں، جو صلاح الدّین [ایّوبی] کو "Soldano di Babilonia" کہتا ہے۔

مآخذ: یاقوت، ۱: ۴۵۰؛ (۲) المقریزی: خِطط، طبع IFAO، ۵، ۶: ۱۳-؛ (۳) ابوصالح (طبع Evetto و Butler) ورق ۲۳ ب؛ (۴) Casanova: *Les Noms Coptes du Caire et des Localités voisines*، در BIFAO، ۱: ۲۶؛ (۵) Amélineau: *Géographie de l' Egypte á l' epoque copte*، ص ۷۵ و مواضع کثیرہ؛ (۶) Quatremere: *Mémoires sur l' Égypte*، ۲: ۴۵؛ (۷) *Papyri Schott-Reinhardt*، ص ۹۸؛ (۸) *Zeitschr. für Assyr.*، ج ۴، ۲۰: ۸۴، ۹۱؛ (۹) Caetani: *Annali*، وقائع ۲۱ھ، فصل ۱۴۳؛ (۱۰) A. R. Guest: *The Foundation of Fustat* در JRAS، ۱۹۰۷ء، ص ۴۹ بعد؛ (۱۱) Michele Amari: *I Diplomi Arabi del R. Archivio Fiorentino*، فلارنس ۱۸۶۳ء؛ (۱۲) U. Monneret de Villard: *Recherche sulla Topografia di Qaṣr eš-Šam*، در *Bull. Soc. Royale de Geog. d, Egypte*، ج ۱۲-۱۳۔

(C. H. BECKER)

⊗ **بابُوَیہ القُمّی**: ابو جَعْفر محمد بن علی بن الحسین بن موسٰی بن بابُوَیہ القُمّی الصَّدُوْق، مشہور شیعی محدّث، فقیہ اور ماہر اسماء الرجال [=ابن بابویہ]۔ کہتے ہیں قُم کے رہنے والوں میں کوئی ایسا شخص نہیں گزرا جس کا حافظہ اس کمال کا ہو۔ لفظ بابویہ کے دو تلفّظ کیے گئے ہیں: بابُوْیہ اور بابُوَیہ۔ ۳۸۱ھ/۹۹۱ء میں وفات ہوئی۔ وہ ۳۵۵ھ میں بغداد گئے، اس وقت کم عمر ہی تھے۔ انھیں کوئی تین سو کتابوں کا مصنّف بتایا جاتا ہے۔ ان میں سے ذیل کی کتابیں مطبوعات اور مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں: (۱) کتاب الخصال، مطبوعۂ تہران ۱۳۰۲ھ؛ (۲) کمال الدین (=اکمال الدین)، ہائڈل برگ ۱۹۰۱ء، اس کے شروع میں جرمن زبان میں ملّر کا مقدمہ بھی درج ہے؛ (۳) المقنع (فقہ کے بارے میں)، الجوامع الفقیہ میں شامل ہے، شمارہ اوّل، تہران ۱۲۷۶ھ؛ (۴) الھدایۃ، عدد ۳ کے ساتھ طبع ہوئی ہے؛ (۵) مَنْ لایَحْضُرُہ الفقیہ، لکھنؤ ۱۳۰۷ھ؛ (۶) مَعانی الاخبار (= جامع الاخبار) مخطوطہ؛ (۷) مجالس المَواعظ فی الحدیث، تہران ۱۳۰۰ھ؛ (۸) عُیُونُ (یا عُنْوان) اخبار الرِضا، تہران ۱۲۷۵ھ؛ (۹) اعتقادات الامامیۃ، تہران ۱۳۰۰ھ؛ (۱۰) مُناظرات المَلک رکن الدولۃ مع الصَّدُوْق بن بابویہ؛ (۱۱) ثَواب الاَعْمال؛ (۱۲) عِقاب الاَعْمال؛ (۱۳) کتاب الاَمالی فی الاحادیث والاخبار؛ (۱۴) کتاب التوحید، مطبوعۂ تبریز؛ (۱۵) علل الشرائع والاحکام؛ (۱۶) النصوص علی الائمۃ الاثناعشریۃ؛ (۱۷) صِفات الشیعۃ؛ (۱۸) کتاب الاختصاص؛ (۱۹) غنائم الانام فی مسئلۃ الحلال و الحرام، تہران ۱۳۱۹ھ؛ (۲۰) حقوق الاخوان؛ (۲۱) فضائل الشیعۃ۔ ان کتب کے مخطوطات کے لیے دیکھیے براکلمان۔ اس مصنّف کی مزید کتابوں کے لیے دیکھیے الطوسی: الفہرس [نیز دیکھیے: ابن بابویہ].

مآخذ: (۱) الطوسی: فہرس، شمارہ ۶۹۱، ص ۳۰۴؛ (۲) البحرانی: لؤلؤۃ البَحْرَین، ص ۳۰۹-۳۳۰؛ (۳) الخوانساری: روضات الجنات، ص ۵۵۷-۵۶۰؛ (۴) سرکیس: معجم المطبوعات، تحت ابن بابویہ القُمّی؛ (۵) احمد بن النَجّاشی، ص ۲۷۶؛ (۶) الاستر آبادی: مَنْہَج المَقال، ص ۳۰۷؛ (۷) مُنتھی المقال، ص ۲۸۲؛ (۸) اَمَل الاٰمِل، ص ۶۷۵؛ (۹) الاصفہانی: الذریعۃ؛ (۱۰) براکلمان، ۱: ۱۸۷، تکملہ ۱: ۳۲۱۔

(عبد المنّان عمر)

---

* **بابیّت**: انیسویں صدی عیسوی کے ربع اوّل میں ایران میں جو تحریکیں پیدا ہوئیں ان میں مذہبی اور سیاسی ردِّعمل کے اعتبار سے بابیّت کو قابلِ ذکر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بانی سید علی محمد شیرازی (رک بہ باب، علی محمد) کا دعوٰی تھا کہ اللہ تعالٰی اس سے ہم کلام ہوتا ہے اور [نعوذ باللہ] اس کی طرف وحی نازل ہوتی ہے اور وہ مامور الٰہی اور باب ہے۔ باب کے تصور کے لیے رک بہ باب۔ اس مذہب کی ابتدائی تاریخ کے لیے باب اور باب: محمد علی کے مقالے دیکھیے۔

باب نے اپنی وفات سے پہلے مرزا یحیٰی صبح ازل کو اپنے بعد اپنا خلیفہ نامزد کیا اور پوری جماعت اس کی سرکردگی میں آ گئی۔ گو صبح ازل کا مزاج دھیما تھا اور وہ حکومت سے اُلجھنا نہیں چاہتا تھا تاہم جو آگ ایک دفعہ لگ چکی تھی اسے یکبارگی بجھایا نہیں جا سکتا تھا۔

یحیٰی وحید دارابی (م ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۵۰ء) بن جعفر دارابی ایک پُرجوش بابی تھا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے مرزا جانی کاشانی سے کہا تھا کہ اگر میرا باپ بھی باب کو قبول نہیں کرے گا تو میں اسے بھی خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں گا (نقطة الکاف، ص ۱۲۲)۔ اس نے بُرُوجرد اور صوبۂ کُردستان میں بابی مقاصد کی تلقین شروع کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس علاقے کی اکثریت کو بابی بنا کر وہاں سے فارس کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ آخر رجب ۱۲۶۶ھ/ مئی ۱۸۵۰ء کو نَیرِیز پہنچ کر، جہاں اس کے مؤیّدین موجود تھے اور جن کے لیے خود باب نے ایک 'لوح' بھجوائی تھی، دارابی نے کھلے مقابلے کا رنگ اختیار کر لیا اور اپنے فدائیوں کو لے کر قلعۂ خاجِیہ (نَیرِیز) میں اپنا مستقر بنا لیا۔ اسلحہ جمع کیے اور حکومت سے جھڑپیں شروع کر دیں۔ آخر حکومت نے قلعہ مسمار کر کے دارابی کو قتل کر دیا۔ یہ باب کے قتل سے نو دن پہلے کا واقعہ ہے (*The Dawn-Breakers*، ص ۴۶۵-۴۹۹)۔ باب کے قتل کیے جانے کی ذمّے داری اس ہنگامے پر بھی عائد ہوتی ہے۔

ہر چند کہ بابی تحریک کے آغاز ہی سے حکومت کے ساتھ اس کی آویزش شروع ہو گئی تھی لیکن یہ ٹکراؤ اس وقت بہت بڑھ گیا جب ایک بابی سازش سے (قب Colerneau، ص ۲۸۰، بحوالۂ مقالۂ سیّاح کا انگریزی ترجمہ از براؤن، ص ۵۳) ۲۸ شوال ۱۲۶۸ھ/ ۱۶ اگست ۱۸۵۲ء کو شاہِ ایران پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ ناسخ التواریخ میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے ملّا شیخ علی (جناب اعظم) نے اس قاتلانہ حملے کی تجویز کی تھی۔ اس پر بارہ فدائیوں نے اپنے تئیں پیش کیا تھا۔ ان میں سے صادق زنجانی (جو ملّا شیخ علی کا نجی ملازم بھی تھا)، ملّا فتح اللہ قُمی، ملا محمد تبریزی اور ملّا محمد باقر نجف آبادی اقدامِ قتل میں براہِ راست شریک تھے۔ ان میں سے صادق تو موقع ہی پر ہلاک ہو گیا تھا اور قمی اور تبریزی کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ چار آدمیوں نے عین آخری وقت میں ہمت ہار دی تھی۔

شاہ ایران پر بابیوں کے حملے نے بابی تحریک کو حد درجہ بدنام کر دیا۔ تاہم اس کے بعد بابیوں میں پھر سے زندگی کے آثار نمودار ہو گئے اور حکومت کی داروگیر بھی بڑھ گئی۔ اس کے اسباب پر مرزا جانی کاشانی کی نقطة الکاف (ص ۲۵۱) سے روشنی پڑتی ہے۔ ہر چند کہ نقطة الکاف کی تالیف شاہ پر قاتلانہ حملے سے پہلے کے وقائع پر ختم ہو جاتی ہے اور اس کتاب میں بابی تاریخ کا یہ اہم واقعہ بیان نہیں ہوا لیکن ایک روایت کا اس نے ذکر کیا ہے جس میں بابیوں کو یہی راہ اختیار کرنے کی ہدایت تھی۔

شاہ پر قاتلانہ حملے کے بعد بابیوں پر عرصۂ حیات اَور بھی تنگ ہو گیا۔ حکومت نے مزید گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تب ان میں سے بہت سے دوسرے ملکوں میں بھاگ گئے۔ اکثر نے بھیس بدل لیا۔ چالیس گرفتار ہونے والوں میں سے مرزا حسین علی نوری (بہاء اللہ) بھی تھا، جسے ہتھکڑیاں پہنا کر شمران سے تہران بھجوا دیا گیا۔ تحریک کا سربراہ صبح ازل بھاگ کر بغداد چلا گیا۔ بعد میں مرزا حسین علی (بہاء اللہ) بھی حکومت کی قید سے رہا ہونے کے بعد اکتوبر ۱۸۵۲ء کو وہاں پہنچ گیا۔ متعدد دوسرے بابیوں نے بھی عراق کی راہ لی۔ اس طرح بابی تحریک کا مرکز ایران سے ترکی مقبوضات میں منتقل ہو گیا۔

اب تک تحریک کا سربراہ بظاہر صبح ازل تھا لیکن دراصل عملی انصرام کلیۃً اس کے بھائی مرزا حسین علی نوری (بہاء اللہ) کے ہاتھ میں تھا۔ جب بابی مرکز کو بغداد میں منتقل ہوئے دس برس گزر گئے تو اس کی جد و جہد ایک دفعہ پھر ایرانی حکومت کے لیے وجہ پریشانی بن گئی۔ چنانچہ ۱۲ ذوالحجہ ۱۲۷۸ھ/ ۱۰ مئی ۱۸۶۲ء کو ایرانی حکومت نے ترکی حکومت سے درخواست کی کہ بابیوں کا مرکز ایرانی سرحدوں سے اَور دور کر دیا جائے تاکہ یہ لوگ ایران میں کوئی انقلاب برپا نہ کر سکیں۔ اس خط میں ایرانی حکومت نے یہ بھی لکھا کہ مرزا حسین علی نوری خفیہ طور پر ابتری پھیلا رہا اور بیوقوفوں اور جاہلوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ اس نے بعض اوقات بغاوت برپا کرنے کی کوششیں بھی کی ہیں اور قتل و غارت میں بھی اس کا ہاتھ ہے۔ یہ لوگ اسلامی حکومت کے مخالف ہیں اور مسلمانوں کے خلاف ان کی حرکات بے رحمانہ اور سفاکانہ ہیں۔ براؤن نے اپنی کتاب *Materials for the study of the Babi Religion*، (ص ۲۷۹-۲۸۷) میں ایرانی حکومت کا اصل خط اور اس کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس پر ترکی حکومت نے احکامات جاری کر دیے کہ صبح ازل اور مرزا حسین علی نوری کو ایڈریانوپل منتقل کر دیا جائے۔ اس پر مرزا حسین علی نوری ۲۰ اپریل ۱۸۶۳ء کو اپنی دو بیویوں، تین بچوں اور کچھ مریدوں کے ساتھ بغداد سے روانہ ہو گیا۔ چار ماہ تک قسطنطینیہ میں رہا اور ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کو ایڈریانوپل پہنچ گیا۔ صبح ازل اور بہاء اللہ اس جلا وطنی میں دسمبر ۱۸۶۳ء سے اگست ۱۸۶۸ء تک رہے (نقطة الکاف پر براؤن کا دیباچہ، ص XXXII ببعد)۔ ایڈریانوپل روانہ ہونے سے پہلے مرزا حسین علی (بہاء اللہ) نے صبح ازل سے کہا کہ باب کی تحریرات لے کر وہ ایران چلا جائے (براؤن: *Materials for the study of Babi Religion*، ص ۲۱)۔ اب سے پانچ سال پہلے صبح ازل نے بطور پیشوا کے مرزا حسین علی سے کہا تھا کہ اپنے 'بن باس' کو ختم کر کے بغداد آ جائے لیکن اب یہ حالت تھی کہ مرزا حسین علی صبح ازل

کو ہدایات دے رہا تھا لہٰذا صبح ازل نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ بابیوں کے متعلق ایرانی حکومت کے رویے سے بے خبر نہ تھا۔ آخر وہ وقت آ پہنچا جس کا دیر سے اندازہ کیا جا رہا تھا اور صبح ازل اور بہاء اللہ کے اختلافات کھل کر سامنے آ گئے اور بابی مذہب دو فرقوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک فرقہ بہائی کہلایا جو مرزا حسین علی بہاء اللہ کے پیچھے چلا۔ یہ لوگ اکثریت میں تھے، دوسرے ازلی کہلاتے ہیں جو مرزا یحییٰ صبح ازل کے مرید رہے۔ کہا جاتا ہے کہ صبح ازل اور بہاء اللہ نے ایک دوسرے کو زہر دینے اور مروا ڈالنے کی کوششیں بھی کی تھیں (*Materials for the study of the Babi Religion*، ص ۲۲ ببعد و مقالۂ سیاح، انگریزی ترجمے پر براؤن کی تعلیقات، ص ۳۵۹)۔

جب صبح ازل اور بہاء اللہ ابھی اِدرنہ ہی میں تھے تو بہاء اللہ کے چند مریدوں نے صبح ازل کے ایک مرید مرزا نصر اللہ کو زہر دے کر مروا ڈالا۔ اسی طرح اور بہت سے ازلی جیسے سید محمد اصفہانی، آقا جان، اور مرزا رضا قلی، آقا سید علی عرب، ملّا رجب علی، آقا محمد علی اصفہانی، مرزا احمد کاشانی (مرزا جانی کاشانی کا بھائی)، مرزا محمد رضا، حاجی ابراہیم، حاجی جعفر سوداگر، حسین علی، ابو القاسم کاشانی، مرزا بزرگ کرمان شاہی وغیرہ خفیہ طور پر مار ڈالے گئے۔ جن میں بعض باب کے خاص ساتھی اور حروف حیی میں سے تھے (نقطۃ الکاف پر براؤن کا دیباچہ)۔

بابیوں کے اس باہمی فتنہ و فساد کو دیکھ کر ترکی حکومت نے دانشمندانہ قدم اٹھایا۔ اس نے بہاء اللہ اور اس کے ساتھیوں کو تو عکّہ (فلسطین) منتقل کر دیا اور صبح ازل اور اس کے ساتھیوں کو Famagusta (صقلیہ) بھجوا دیا؛ ورنہ فریقین ایک دوسرے کو خفیہ طور پر قتل کرتے کرتے ختم کر دیتے۔ اِدرنہ کے زمانۂ قیام میں صبح ازل اور بہاء اللہ دونوں کو حکومت کی طرف سے وظائف ملتے تھے۔ ایک موقع پر صبح ازل نے حکومت سے شکایت کی کہ بہاء اللہ نے ان کے وظائف روک رکھے ہیں بلکہ ان کی خوراک تک بند کر دی ہے (براؤن *Materials for the study of the Babi Religion*، ص ۲۴)۔ صبح ازل کو صقلیہ میں بھی ترکی حکومت کا وظیفہ ملتا رہا، جو ۱۱۹۳ پیاس ماہانہ تھا۔ آخر ۲۹ اپریل ۱۹۱۲ء کو صبح ازل کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت کوئی بابی بھی وہاں موجود نہ تھا کہ تجہیز و تکفین ہی کر سکے۔ اس نے آقا مرزا محمد ہادی دولت آبادی کے بیٹے کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ صبح ازل کا خاندان بعد میں غربت اور کس مپرسی کا شکار ہو گیا۔ بڑا بیٹا ماغوسا (Famagusta) کے ریلوے سٹیشن پر قلی کا کام کرتا رہا۔ ایک بیٹا عیسائی ہو گیا۔ اس طرح بابی تحریک کا دوسرا دَور اس کے پہلے خلیفہ اور نقطۂ ثانی کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

محمد علی باب کے مطالعے سے پہلے ہمیں شیخ احمد بن زین الدین الاحسائی [رک بآن]، جو خود شیعہ تھا لیکن جس کے آبا و اجداد سنّی تھے، (۱۱۶۶ھ/ ۱۷۵۳ء (لیکن بقول براؤن ۱۱۵۷ھ، مقالۂ سیّاح، انگریزی ترجمہ، ص ۲۳۵)۔ ۱۲۴۱ھ/ ۱۸۲۶ء)، اس کے خلیفہ کاظم رشتی (م ۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۳ء)، ملّا محمد مامقانی، مرزا کریم خاں کرمانی (مصنّف اذھان الباطل جو باب کے رد میں ہے اور جس کے زیرِ قیادت وہ لوگ شیخی خیالات سے منسلک رہے جنھوں نے باب کو نہ مانا تھا) اور سیّد احمد بن سیّد کاظم رشتی کے حالات کا اور شیخ احمد احسائی کے دبستانِ عقائد، یعنی فرقۂ شیخی [رک بآن] کا مطالعہ کرنا چاہیے؛ کیونکہ آگے چل کر اسی دبستان سے بابیّت پیدا ہوئی اور اسی نے اس مذہب کے لیے راستہ ہموار کیا۔

شیخیوں کا خیال تھا کہ تخلیقِ کائنات کی عِلّتِ غائی اور اس کا اصل باعث دوازدہ امام ہیں۔ وہ مشیّت ایزدی کے مظہر اور الٰہی منشا کے ترجمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے تمام کام انھیں کے وسیلے سے صادر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات فہم سے بالاتر ہے اور ہم اس کا ادراک مادّی وجودوں ہی کے ذریعے کر سکتے ہیں، جو اس کی اعلیٰ ہستی کے مظہر ہیں۔ امام غائب کے بعد ان کے قائم مقام اور عوام کے درمیان واسطہ وہ ہستیاں ہیں جو ''باب'' کہلاتی ہیں۔ وہ شیعۂ کامل اور واسطۂ فیض ہیں۔ یہ عقیدہ ان کے ہاں رکن رابع کہلاتا ہے۔ شیخی خیالات کا مرکز اِس وقت کرمان میں لنگر (مقام) میں موجود ہے۔ یہ جگہ شاہ نعمت اللہ ولی کے مقبرے کے قریب ہی ہے اور مرزا کریم خان، جو کاظم رشتی کے بعد اس فرقے کا راہبر تھا، کی اولاد (آقایان) اب بھی وہاں رہتی ہے۔

شیعہ کا ایک فرقہ ۲۷۵ھ (باختلاف روایت ۲۶۵ھ، ۲۶۶ھ) سے جب کہ ان کے امام محمد بن حسن عسکری غائب ہوئے معتقد رہا ہے کہ وہ اب تک اپنے جسد عنصری کے ساتھ کسی غار میں زندہ ہیں اور وہی آخری زمانے میں پھر ظہور کریں گے۔ شیخیوں نے اسی تصور کو اس ترمیم کے ساتھ اپنا لیا کہ بے شک امام غائب اس دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے، لیکن دراصل یہ بعینہٖ امام غائب نہیں ہوں گے بلکہ ان کی خو بو پر ان کے مثیل ہوں گے جن کے ظہور کی ہمیں امید رکھنی چاہیے۔ الاحسائی نے اپنی وفات (۱۲۴۱ھ) سے پہلے اپنا یہ تصوّر بھی پیش کیا کہ اگلی صدی کے نصف میں وہ امام منتظر پیدا ہو جائے گا اور وہی اپنے وقت کا مہدی بھی ہوگا۔ یہی تصورات ہمیں باب کے دعوے کے پس منظر میں ملتے ہیں۔

باب کا دعویٰ کیا تھا؟ اس سوال کا جواب کچھ مشکل ہے، کیونکہ بعض لوگوں کے نزدیک باب کے دعوے ایسے مبہم اور مغلق ہیں کہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود ان کی تعیین ممکن نہیں ہو سکی۔ پروفیسر براؤن نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصّہ بابیّت کے مطالعے میں صرف کیا، مگر وہ بھی پوری طرح اس گرہ کو نہیں کھول سکے۔

باب کے دعووں میں تنوّع ہے۔ اس نے اپنے خیالات کے اظہار میں بہت سی مغلق اور جدید مصطلحات اور مبہم عبارات کا سہارا لیا ہے۔ یہی چیز ہے جس نے اصل دعوے کو سمجھنا اَور بھی مشکل کر دیا ہے۔ خود لفظ باب جس پر اس کے سب سے بڑے دعوے کی بنیاد ہے، متعدد مفہوموں کا آئینہ دار رہا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں دروازہ۔ یہ کس چیز اور کس وجود کا 'دروازہ' تھا؟ اس بارے میں ایک نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ وہ امام غائب کا نمائندہ اور اس کا باب ہے (براؤن، ۴: ۱۵۰)۔ اس

کے مخاطب اس کا یہی دعوٰی سمجھتے تھے (نقطة الکاف، ص ۱۱۶)۔ ۱۲۶۳ھ میں جب حکومت کی طرف سے باب پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا تو اس سے ایک سوال اس کے دعوے کے بارے میں بھی کیا گیا تھا اور پوچھا گیا تھا کہ لفظ باب سے اس کی کیا مراد ہے۔ اس نے وہی جواب دیا جو اس حدیث میں بیان ہوا ہے: اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُهَا (اس سوال و جواب کی تفصیلات کے لیے دیکھیے روضات الصفاء، تاریخ جدید، قصص العلماء، ناسخ التواریخ)۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کا دعوٰی باب العلم ہونے کا تھا۔ اسے صداقت کا دروازہ بھی کہا جاتا ہے۔ ایک نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ اس کا دعوٰی بابِ امام نہیں بلکہ باب اللہ ہونے کا ہے، جس کے لیے بیان، فارسی کے باب اول، واحد ۲ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ایک تصور یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ علی محمد وہ باب تھا جس میں سے گزر کر ایک مظہر جس کا مقام فردوس سے بھی بڑھ کر ہوگا کائنات میں داخل ہوگا (*The Dawn-Breakers*، دیباچہ ص XXIX، XXXI) گویا وہ بہاء اللہ کے ساتھ وہی نسبت رکھتا تھا جو مسیحؑ کے لیے یوحنّا کو حاصل تھی۔ باب نے مہدی ہونے کا دعوٰی بھی کیا بلکہ مہدی معہود کی آمد کا مسئلہ ہی بیان کے نفس مضمون کی روحِ رواں ہے۔ بعض جگہ باب نے اپنے آپ کو ''رسولے از رسولانِ او'' بھی لکھا ہے (بیان، فارسی، باب ۱۵، واحد ۲)۔

باب کے دعوے کے پانچویں ہی سال اس کی دعوت کے متعلق اس کے مریدوں میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء میں اس کے چوٹی کے مرید جب بدَشت میں جمع ہوئے تو ان میں یہ زبردست اختلاف موجود تھا کہ باب قرآن مجید کا مفسّر ہے یا موسیٰؑ کی طرح جدید شریعت کا حامل۔ مرزا حسین علی نوری (بعد کے بہاء اللہ) نے دوسرے نقطۂ نگاہ پر سب کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ متعدد مریدوں کو وہ قائل نہ کر سکا اور وہ اس تنظیم سے الگ ہو گئے تاہم اکثریت کی حمایت سے دین بابی کے استقلال کا اعلان کر دیا گیا اور قرار دیا گیا کہ باب کے دعوے نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے دَورِ نبوت کو ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء میں [نعوذ باللہ] ختم کر دیا ہے اور معاد سے متعلّق قرآن مجید کی اصطلاحات: موت، قیامت، ساعۃ، حشر، نشر وغیرہ دورِ نبوت کے اختتام کی مظہر ہیں۔

باب کا دعوٰی نقطۂ اولٰی، نقطۂ اعلٰی اور نقطۂ بیان اور نقطۂ مشیّت ہونے کا بھی تھا جو ایک دوسرے نقطۂ نگاہ سے اصطلاحِ باب ہی کی توضیح ہے۔ اس کے مرید بعض اوقات مسیح ناصری سے باب کی متعدد مشابہتوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسے مثیل مسیح بھی مانتے ہیں۔ باب نے اپنے آپ کو 'شجرۂ حقیقت' بھی قرار دیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مورد وحی و الہام اور شریعت کا حامل بھی کہتا تھا۔ چنانچہ بیان فارسی کے پہلے باب کے دوسرے واحد میں لکھا ہے کہ بیان اسی طرح کلام اللہ ہے جس طرح قرآن کلام اللہ ہے [نعوذ باللہ]۔ اس کا یہ بھی دعوٰی تھا کہ اس کا مرتبہ گزشتہ انبیا سے بڑھ کر ہے [نعوذ باللہ]۔

بابیوں کا علم الٰہیات و مابعد الطبیعیات ان کی خود ساختہ بہت سی مصطلحات سے گھرا ہوا ہے، لیکن متعدد صورتوں میں اسمٰعیلیہ کے باطنی عقائد سے مشابہ ہے۔ خود باب نے اپنے دعوے کے بعد حج بیت اللہ کیا، پھر قرآن مجید کی تفاسیر بھی لکھیں اور اپنے آپ کو اسلام کا متبع بھی ظاہر کیا، لیکن اس کا دعوٰی بتدریج بڑھتا چلا گیا اور وہ اسلام سے بے تعلق ہوتا گیا۔ اس کے ماننے والے قرآن مجید کو آخری شریعت نہیں مانتے اور نہ اس زمانے کے لیے اور نہ آئندہ زمانے کے لیے اسے مکمل قرار دیتے ہیں۔ گو وہ قرآنی شریعت بلکہ کسی بھی سابقہ شریعت کے لیے اپنی عام بول چال میں منسوخ کا لفظ استعمال نہیں کرتے تاہم ان کے نزدیک بابی شریعت نے قرآن مجید اور کتب سابقۂ الٰہیہ کی تکمیل کی ہے اور اس سلسلۂ ارتقا میں اس کا مقام قرآن مجید سے آگے ہے۔ حج بیت اللہ کا مقام بھی ان کے ہاں اب مکّۂ معظّمہ نہیں اور نہ بیت اللہ کی طرف منہ کر کے یہ لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ بدَشت کانفرنس میں قرۃ العین نے غیر مبہم الفاظ میں کہا کہ بھائیو! ہم جس دَور سے گزر رہے ہیں اس میں گزشتہ دور ختم ہو چکا ہے اور گزشتہ شریعت بھی منسوخ ہو چکی ہے۔ یہ نماز، روزہ، عبادات اور نبی پر درود و سلام بھی بیکار ہے۔ باب ہمیں نئی شریعت بخشے گا (ناسخ التواریخ)۔

بابیوں کے نزدیک ہر ہزار سال کے بعد شریعت بدل جاتی ہے اور ظہور اسلام کے ہزار سال کے بعد بابیّت کا ظہور ہوا۔ اب اگلی شریعت ایک ہزار سال کے بعد آئے گی۔ اور اس عرصے میں ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء سے بابی شریعت کا اتباع ہم پر لازم ہے۔ باب نے [حضرت] آدمؑ سے اپنے عہد تک دنیا کی عمر ۱۲۲۱۰ سال بتائی ہے (بیان، فارسی، واحد ۳، باب ۱۳)۔ اس کے نزدیک 'عرفان الٰہی' سے اس کے مظہر کا عرفان، 'لقاء الٰہی' اور 'پناہ الٰہی' سے اس کے مظہر کا لقاء اور اس کی پناہ مراد ہے (بیان، فارسی، واحد ۷، باب ۷)۔ اللہ تعالٰی کی طرف سے ہر بعد میں آنے والا پہلے سے افضل و اکمل ہے،..... عالم قرآن کے بعد اب بیان کی دنیا پیدا ہو چکی ہے۔ ان کے نزدیک قرآن مجید نے توحید الٰہی کا مضمون بیان تو کر دیا ہے لیکن اس میں ایسی مکمل توضیح موجود نہیں جیسی باب نے کی ہے [نعوذ باللہ]۔ ان کے خیال میں ہستیِ مطلق تین عالموں پر مشتمل ہے: ایک جوہر یزدانی کا عالم، جو یکسر ناقابلِ فہم اور ماورائے ادراک ہے؛ دوسرا کائنات اور انسانیت کا عالم؛ تیسرا تمثال کا عالم، یعنی وہ آئینۂ شفاف جس میں انسان اللہ تعالٰی کو دیکھ سکتا ہے۔ بابی اصول و عقائد کے مطابق اس غیر مرئی عالم کو جو مرئی اشیا کے درمیان اور ان کے پیچھے پوشیدہ ہے بڑی اہمیت حاصل ہے۔

حروف اور ان کی عددی قیمت بابی ادب میں بہت مستعمل ہے اور انّیس کا عدد ان کے ہاں خصوصیت رکھتا ہے۔ ہمیشہ کی طبعی تقویم کو ترک کر کے باب نے ایک جدید تقویم پیش کی، جس میں سال کو بارہ کے بجائے انّیس حصّوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر مہینے کے انّیس دن مقرر کیے گئے ہیں۔ مصدّقین کی انّیس کی تعداد کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے۔

باب مشکل ''ہیاکل'' کو بڑے پیچیدہ خط شکستہ میں خوش اسلوبی سے لکھا کرتا

تھا۔ بابی کہتے ہیں کہ وہ تعویذ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

باب نے ایک نیا اور پیچیدہ طریقِ توارث اور دستورِ میراث بھی پیش کیا ہے۔

اخلاق و فقہ کے متعلق جو احکام بیان میں درج ہیں انھیں ترتیب دینا قدرے مشکل ہے۔

جرائم کی انتہائی ہلکی سزائیں، جو جرمانہ وغیرہ تک محدود ہیں، بیان کی خصوصیات میں سے ہیں۔ سب سے بڑی سزا جو قتل کے لیے مقرر کی گئی ہے یہ ہے کہ قاتل مقتول کے ورثہ کو گیارہ ہزار مثقال سونا ادا کرے اور متواتر اُنیس برس تک مقاربت سے پرہیز کرے۔

باب نے آمدٹیکس (Income Tax) کے بجائے سرمائے پر ٹیکس (Capital Tax) کا طریق تجویز کیا ہے اور وہ بھی انیس فی صد۔

بیان میں تمباکو کے استعمال اور تمباکو فروشی کی بھی ممانعت ہے۔

نماز جنازہ اور تجہیز و تکفین کے علاوہ دوسری اجتماعی عبادتیں متروک کر دی گئیں ہیں۔

باب نے ایک آنے والے کی پیشگوئی بھی کی ہے جس کا ذکر اس نے 'مَنْ یُظْهِرُهُ اللّٰهُ' کے الفاظ سے کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کا ظہور غیاث کی عددی قیمت، یعنی ۱۵۱۱ء، یا زیادہ سے زیادہ مستغاث کی عددی قیمت، یعنی ۲۰۰۱ء، سے پہلے ہوگا (بیان، فارسی، باب ۱۷، واحد ۲)۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ باب نے مَنْ یُظْهِرُهُ اللّٰهُ کی بعثت کا زمانہ بہت قریب بتایا تھا، بلکہ صبح ازل سے یہاں تک کہا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ تمھیں مَنْ یُظْهِرُهُ اللّٰهُ کی ملاقات کا شرف حاصل ہو (نقطة الکاف، ص ۲۴۴؛ نیز دیکھیے *The Epistle to the son of the Wolf*، ص ۱۲۹)۔

بابیوں کی تاریخ کو سیاسی لحاظ سے دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور وہ ہے جو اس مذہب کے آغاز سے لے کر اس تشدد پر ختم ہوتا ہے جس کا سلسلہ ناصرالدّین شاہ قاچار پر بابیوں کے قاتلانہ حملے کے بعد شروع ہوا۔ دوسرا دور وہ ہے جسے صلح پسندانہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ دور پہلے دور کے اختتام کے بعد سے اب تک جاری ہے۔

پہلے دور میں بابیوں نے حکومتِ ایران کے خلاف جو مسلسل اور متشددانہ اقدامات کیے اور حکومت ایران نے جو پکڑ دھکڑ اور سزا و تعذیب بابیوں کے ساتھ روا رکھی، اس کا پس منظر سمجھنے کے لیے ان معتقدات پر ایک نظر ضروری ہے جو قائم بامراللہ اور خونی مہدی کے ظہور کے متعلق بابی مذہب کے ظہور سے پہلے وہاں کے لوگوں میں رائج تھے، کیونکہ یہی وہ معتقدات ہیں جن سے باب نے کم سے کم اپنے ابتدائی دعوے کا چراغ روشن کیا تھا۔ ظہورِ مہدی کے متعلق بابیوں کے پیش رووں کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ وہ اپنے ظہور کے بعد لوگوں کو بنوکِ شمشیر اپنے مذہب کا پیرو بنائیں گے اور اپنے ماننے والوں کو حکم دیں گے کہ جو ان کے عقیدے کو نہ مانے اور ان کی راہ میں رکاوٹ بنے اسے بے دریغ قتل کر دیں، اس کے بیوی بچوں اور مال و متاع پر جبراً قبضہ کر لیں اور جلد تر اپنی حکومت قائم کریں۔ جب باب نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا تو حکومت، عوام اور باب کے پیرو طبعاً ان متشددانہ عقائد کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے؛ چنانچہ باب کے دعوے کے ساتھ ہی بابیوں نے مسلّح اقدامات شروع کر دیے جن کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ باب کے دعوے پر ابھی آٹھ ہی سال گزرے تھے کہ بعض بابیوں نے شاہ ایران پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ صاحب ناسخ التواریخ نے صاف صاف لکھا ہے کہ ایران میں سیاسی انقلاب لانے کے لیے کوفے سے مسلّح بغاوت کی سکیم باب نے تیار کی تھی اور میرزا جانی کاشانی (جو بابی مذہب کا سب سے پہلا مؤید مؤرّخ ہے) کے الفاظ بھی خاصی حد تک اس کی تائید کرتے ہیں (نقطة الکاف، ص ۱۱۱)۔ پھر بابیوں کی بہت سی سرگرمیاں مخفی بھی تھیں؛ اس حقیقت کو غیر جانب دار مصنّف براؤن اور جانب دار میرزا جانی کاشانی دونوں نے تسلیم کیا ہے (مقالۂ سیّاح، انگریزی ترجمہ، تعلیقات از براؤن، ص ۸۰، ۴۰۹)۔ باب نے حکومتِ وقت کو بھی لکھا کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو وہ دول خارجہ کو ایران کا محکوم بنا سکتا ہے اور حدود مملکت میں توسیع کروا سکتا ہے (ناسخ التواریخ، تحت شرح حال ملّا حسین بشرویہ)۔ قلعۂ شیخ طبرسی میں محمد علی بارفروشی کے اپنے متعلق یہ الفاظ بھی قابلِ توجہ ہیں کہ وہ خود سلطانِ حق ہے، پوری دنیا اس کی محکوم ہوگی اور مشرق و مغرب کے بادشاہ اس کے سامنے سرنگوں ہوں گے (نقطة الکاف، ص ۱۶۲)۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال فتنہ و فساد اور قتل و غارت کا موجب ہی ہو سکتی تھی۔ اس صورتِ حال نے حکومت کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ یہ تحریک مذہبی سے زیادہ سیاسی ہے اور یہ لوگ سیاسی انقلاب لانے کے لیے بے تاب ہیں۔ لہٰذا حکومت کے علاوہ عام شہری بھی ان کے ہاتھ سے محفوظ نہیں۔ خود حکومتِ وقت کی کم زوری اور بعض بابیوں کا یہ ایقان کہ مہدی موعود اور اس کی جماعت کی سیاسی فتح یقینی ہے مسلّح اقدامات کا موجب بنا (نیز دیکھیے *The Babi Movement*، ص ۱۸ ببعد؛ *The Dawn-Breakers*، ص ۱۴۶)۔ باب اور اس کے مریدوں کی سرگرمیوں کو کس طرح حکومت اور مذہب دونوں کے لیے نقصان دہ سمجھا جاتا تھا، اس کی طرف وہ الفاظ بھی راہ نمائی کرتے ہیں جنھیں خود مقالۂ سیاح (ص ۲۸) میں نقل کیا گیا ہے: ''این شخص و پیروان [اُو] ضلالت محض اند و مضرت دین و دولت''۔ حالانکہ یہ کتاب بابی مذہب کی مداحی میں لکھی گئی ہے بلکہ بعض نے تو اسے خود عبدالبہاء کی تصنیف قرار دیا ہے۔ بہرحال آج کل بابی حلقے اس چیز کو تسلیم نہیں کرتے اور ان کے نزدیک بابیوں کے تمام مسلّح اقدامات حفاظت خود اختیاری کے تحت تھے (*The Dawn-Breakers*، ص XXXIV)۔ بابی تاریخ کے آغاز سے پہلے ملک میں جو سیاسی خلفشار تھا اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور فرقۂ باطنیہ اور حسن بن صباح کی آزمائشیں لوگوں کے سامنے تھیں۔ ۱۸۴۰ء میں سبعیہ شیعہ ایک بغاوت برپا کر چکے تھے اور اس سے صرف چار سال بعد بابی تحریک کا آغاز ہوا تھا (*The Babi Movement*، ص ۸۹ ببعد)۔

آخر جب بعض سرکردہ بابیوں نے، جن میں بہاء اللہ بھی شامل تھا، شہنشاہ پر قاتلانہ حملے کے خلاف بیانات دیے، تحریک کے سربراہ صبح ازل کی دھیمی طبیعت آڑے آئی اور بعض امن پسند لوگوں نے بابی تحریک کا رخ قتل وغارت سے امن و سکون کی طرف بدلنے کی جدوجہد کی تو حکومت کی سختیاں بھی کم ہوگئیں اور بابیوں کی شورشیں اور ان پر تشدّد کی لہر مائل بسکون ہوکر آخر امن پسندی کے دور کا آغاز ہوگیا، جو اب تک موجود ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ حکومت بلاوجہ باب سے مزاحم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ مقالۂ سیاح کا مصنّف باب کے متعلّق محمد شاہ بادشاہِ ایران (م ۱۸۴۸ء) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے: ''این جوان از سلالۂ پاکست و از خاندانِ مخاطبِ لولاک (لماخلقت الافلاک) تا از او امور مغایری کہ منافی راحت و آسائش عمومی است صادر نہ گردد حکومت تعرض ننماید'' (ص ۲۸) اور اس پر حکومت کا عمل درآمد بھی تھا۔

باب کی اکثر تصانیف تلف ہوچکی ہیں (بہاء اللہ: ایقان، ص ۱۸۲) اور جو موجود ہیں وہ بھی بیشتر مخطوطات کی شکل میں ہیں اور ان کا انتساب بھی باب کی طرف محلِّ نظر ہے۔ اس کی ایک وجہ ملک کا عام سیاسی خلفشار بھی ہے۔ اس کے علاوہ عوام اور بابیوں کے متعلق حکومت کے مخالفانہ رویے اور ان خانہ جنگیوں کا نام بھی لیا جاسکتا ہے جو بابی مذہب کے دو فرقوں — بہائیوں اور ازلیوں — میں رونما ہوئیں۔

باب کی عربی عبارات اغلاط سے خالی نہیں۔ تبریز میں جس جرگے نے باب کو موت کی سزا دی تھی اس کے سامنے باب نے اپنے بعض الہامات پیش کیے تھے، جن کی لسانی اور ادبی غلطیاں اس وقت بھی لوگوں کے سامنے آگئی تھیں (مقالۂ سیاح، ص ۲۶؛ ناسخ التواریخ، در شرح حال ملّا حسین بشرویہ)۔ باب کی طرف منسوب بعض کتب کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) احسن القصص یا قیوم الاسماء (ایک جلد، سورۂ یوسف کی منظوم عربی تفسیر، جس کا فارسی ترجمہ قرۃ العین طاہرہ نے کیا)؛ (۲) الواح اولی الامر؛ (۳) صحیفہ بین الحرمین؛ (۴) مکتوب بنام شریف مکہ (لیکن اس کے آخر میں باب نے اپنا نام اور پتا نہیں لکھا، *The Dawn-Breakers*، ص ۱۳۹)؛ (۵) کتاب الروح؛ (۶) فضائل سبعة (اذان میں تبدیلی کے بیان میں)؛ (۷) فروع عدلیه؛ (۸) شرح بَسْملة و تفسیر سورة العصر؛ (۹) تفسیر سورة الکوثر؛ (۱۰) تفسیر القرآن؛ (۱۱) تفسیر القرآن (یہ مقدم الذکر تفسیر سے علٰیحدہ ہے، بلکہ کہا جاتا ہے کہ باب نے قرآن مجید کی تیس تفاسیر لکھی تھیں؛ *The Dawn- Breakers*، ص ۳۱)؛ (۱۲) الواح؛ (۱۳) بیان عربی (ایک جلد، اس میں گیارہ واحد اور ہر واحد کے ۱۷ ابواب ہیں)؛ (۱۴) بیان فارسی (ایک جلد، اس میں ۹ واحد اور ہر واحد کے ۱۹ ابواب مجوزہ تھے، لیکن آخری واحد میں صرف دس باب ہیں۔ باب خود اسے مکمل نہ کرسکا، بلکہ اس نے اپنے خلیفہ (صبح ازل) کو تاکید کی کہ اسے مکمل کرے (نقطة الکاف، ص ۲۴۴)۔ یہ کتاب بابیوں کی نظر میں وہی مقام رکھتی ہے جو مسلمانوں کی نظر میں قرآن مجید کا ہے۔ اس کی وجہ سے بابیوں کو بعض وقت ''اہل بیان'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ چھپ چکی ہے (فرانسیسی ترجمہ، پیرس ۱۹۱۱-۱۹۱۴ء، از Nicolas)؛ (۱۵) دلائل سبعة؛ (۱۶) لوح حروفات؛ (۱۷) تفسیر سورة الفاتحة؛ (۱۸) شئون خمسة؛ (۱۹) آیات (دو جلد)؛ (۲۰) کتاب جزاء (۲ جلد، غالباً یہ مریدوں کے ناموں کی خفیہ فہرست ہے)؛ (۲۱) دعوات؛ (۲۲) شئون مختلفة؛ (۲۳) کتاب اسماء (۲ جلد، غیر مکمل)؛ (۲۴) کتاب هیاکل؛ (۲۵) دعوات و زیارات؛ (۲۶) کتاب هفت صد سورة؛ (۲۷) صحیفة حجتیة؛ (۲۸) فروع و اصل (پریشان اوراق، چار بستے)۔

مآخذ: باب اور بہاء اللہ اور صبح ازل کی تالیفات کے علاوہ: (۱) میرزا تقی مستوفی: ناسخ التواریخ، جلد ۲ بعد؛ (۲) میرخواند: روضة الصفاء، تہران ۱۲۷۴ھ؛ (۳) میرزا حسین ہمدانی: تاریخ جدید، انگریزی ترجمہ از نکلسن، کیمبرج ۱۸۹۳ء؛ (۴) میرزا محمد بن سلیمان: قصص العلماء، طبع ثانی، تہران ۱۳۰۴ھ؛ (۵) کسی گمنام بہائی کی تالیف: مقالۂ سیاح، کیمبرج ۱۸۹۱ء، انگریزی ترجمہ از براؤن (E. G. Browne)، مع تعلیقات، کیمبرج ۱۸۹۱ء و اردو ترجمہ از مصطفٰی رومی: باب الحیات، لاہور ۱۹۰۸ء۔ بعض نے مقالۂ سیاح کو عبدالبہاء (م ۱۹۲۱ء) کی طرف منسوب کیا ہے؛ (۶) میرزا جانی کاشانی: نقطة الکاف، طبع براؤن، لائڈن ۱۹۱۰ء (بابیوں کی تائید میں سب سے پہلی تاریخ؛ میرزا جانی باب کا مرید تھا اور اس سے ملا بھی تھا)؛ (۷) براؤن (E. G. Browne): *History of Persian Literature in Modern Times*، کیمبرج ۱۹۲۴ء، ج ۴، بہ امداد اشاریہ؛ (۸) *Journal of the Royal Asiatic Society*، ۱۸۸۹ء؛ (۹) عبدالحسین آوارہ: الکواکب الدّرّیه فی مآثر البهائیة، قاہرہ ۱۳۴۲ھ؛ (۱۰) شوقی افندی: *God Passes By*، Wilmette، ۱۹۵۰ء؛ (۱۱) عبدالبہاء: تذکرة الوفا، حیفہ ۱۹۲۴ء؛ (۱۲) محمد ظاہر مالُمیری: تاریخ شہداء یزد، قاہرہ ۱۳۴۱ھ؛ (۱۳) Martha Root: *Táhirih, the pure*، کراچی ۱۹۳۸ء؛ (۱۴) محمد زَرَندی نبیل: تاریخ نبیل، ترجمہ انگریزی از شوقی افندی: *The Dawn-Breakers*، نیو یارک ۱۹۳۳ء؛ (۱۵) E. G. Browne: *Materials for the study of the Babi Religion*، کیمبرج ۱۹۱۸ء؛ (۱۶) علامہ اقبال: *The Development of Metaphysics in Persia*، لنڈن ۱۹۰۸ء؛ (۱۷) فضل الدین پلیڈر: بہائی مذہب کی حقیقت؛ (۱۸) محمد علی: *History and Doctrines of the Babi Movement*، لاہور ۱۹۳۳ء؛ (۱۹) Lady Sheil: *Glimpses of life and Manners in Persia*، لنڈن ۱۸۵۶ء؛ (۲۰) John Ussher: *Journey from London to Persepolis*، لنڈن ۱۸۶۵ء؛ (۲۱) Robert Graut Watson: *History of Persia from the Beginning of the Nineteenth Century to the year 1858*، لنڈن ۱۸۶۶ء؛ (۲۲) John Piggot: *Persia*، لنڈن ۱۸۷۴ء؛ (۲۳) Laurence Oliphant: *Haifa....*، لنڈن ۱۸۸۷ء، ص ۱۰۳-۱۰۷؛ (۲۴) T. K. Cheyne: *Reconciliation of Races and Religions*؛ (۲۵) P. M. Sykes: *History of Persia*؛

(۲۶) مرزا ابوالفضل: کشف الغِطاء؛ (۲۷) آ. لائڈن، طبع دوم، کے مادّے باب، باب محمد علی، بابی، شیخی، الاحسائی اور جو مآخذ وہاں درج ہیں، نیز وہ مآخذ جو مقالۂ سیاح کی تعلیقات میں براؤن نے ص ۱۷۳ - ۲۱۱ درج کیے ہیں۔ باب اور قرۃ العین کی دستی تحریر اور باب کی قبر کی تصویر کے لیے دیکھیے *The Dawn-Breakers* اور باب کی تصویر کے لیے (۲۸) A. L. M. Nicolas: *Seyyed Ali Mohammad*، پیرس ۱۹۰۵ء؛ (۲۹) *Bahai World*، ج ۳، شمارہ ۳.

(عبدالمنّان عمر)

---

* **باتمان**: [رک بہ] بَتْمَن.

---

* **باتُو** (خانوادہ): باتُو خان [رک بآن] نبیرۂ چنگیز خان [رک بآن] کے جانشین، اردوے مُطلّا کا حکمران خاندان، جس کا زمانۂ حکومت ۱۲۳۶/۴۰ء سے ۱۵۰۲ء تک ہے.

۱۲۲۳-۲۴ء میں منگول فوجوں نے تھوڑی مدت کے لیے اس علاقے میں پیش قدمی کی تھی جو اب یوکرین کے نام سے مشہور ہے (اور کالکا (Kalka) کے مقام پر اسی سال روسیوں کو شکست دی تھی)۔ ۱۲۳۶ء سے ۱۲۴۱ء تک باتو، جو چنگیز خاں کے فرزند اکبر جوچی کا دوسرا بیٹا تھا، روس کے وسیع علاقوں کو اپنے زیرِ اقتدار لانے میں کامیاب ہو گیا۔ صرف روس کا شمال مغربی حصہ جس کا صدر مقام نووگراڈ (Novogorod) تھا، منگولوں کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہ سکا اور گاہے گاہے خراج ادا کرنے کے علاوہ بڑی حد تک آزاد رہا۔ اسی طرح کوہ قاف کا علاقہ بشمول جارجیا [رک بہ گُرجستان] ۱۲۶۰ء تک خاندان باتُو کے زیرِ اقتدار رہا اور ڈینیوب - بلغاریا کا علاقہ ۱۳۱۰ء تک ان کے تسلط میں رہا۔ گلیشیا (Glacia)، موریویا (Moravia)، سلیشیا (Silesia) اور ہنگری میں منگولوں کی پیش قدمی، جو ۱۲۴۱ء میں واقع ہوئی تھی، کوئی پائدار نتائج پیدا نہیں کر سکی.

ان فتوحات کی بدولت جو مغربی منگول سلطنت قائم ہوئی اس کا مرکز باتُو نے پہلے اپنے آباد کردہ شہر سرای (قدیم) اور پھر سرای جدید کو قرار دیا، جو زیریں والگا کے کنارے واقع تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں یہ شہر ترقی کر کے اہم تجارتی مرکز بن گئے۔ ان شہروں کی آبادی مخلوط تھی، جس میں ۱۲۶۱ء کے بعد سے ایک روسی عنصر بھی شامل رہا۔ منگول آبادی کے سب سے زیادہ وسیع مراکز اسی علاقے میں اور کریمیا میں بنے۔ یہ آبادیاں رفتہ رفتہ مقامی ترک آبادی اور فنّی اور مشرقی سلافی اقوام کے ساتھ مخلوط ہو گئیں۔ اس طرح والگا کے تاتاریوں کی ایک نئی قوم وجود میں آئی۔ اس کی زبان ترکی تھی، جو شمال کی جانب والگا کے کناروں پر آباد اقوام میں اور خصوصاً والگا کے بلغاریوں [رک بآن] (Volga Bulgars) میں بھی بولی جاتی تھی۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی تک اس آبادی کی ہیئت خانہ بدوش قبائل کی سی رہی۔ ان لوگوں کے حالات جان آف پلانو کارپینی (John of Plano Carpini) (۱۲۴۵-۴۶ء) اور ابن بَطّوطہ [رک بآن] (۱۳۳۳ء) نے بڑی وضاحت سے بیان کیے ہیں۔ روسی اس نئی سلطنت کو Golden Horde (اردوے مُطلّا) کہتے تھے اور یہی نام یورپ میں بھی مشہور ہوا۔ جدید ترکی نام التین اردو (Altin ordu) اسی کا ترجمہ ہے (ممکن ہے یہ نام اس بنا پر دیا گیا ہو کہ منگول حکمرانوں کے خیموں میں سونے کی اینٹوں کا فرش ہوتا تھا یا ممکن ہے کہ یہ وسط ایشیا کے قدیم رنگوں کی علامات سے مستعار ہو (مقابلے کے لیے لفظ قَرَا (= سیاہ) کا استعمال ملاحظہ ہو)۔ مقامی تصانیف میں اس ملک کو عموماً دشتِ قپچاق کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ باتُو کے بڑے بھائی اُوردا (Orda) نے مغربی سائبیریا میں ایک ماتحت ریاست قائم کی تھی، جسے کبھی کبھی نیلے یا سفید لشکر (Blue or White Horde) کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ریاست اردوے مُطلّا کے ماتحت تھی، لیکن اس کی تاریخ کے متعلق بہت کم معلومات دستیاب ہو سکی ہیں.

باتُو کی توجّہ زیادہ تر منگول سلطنت کے معاملات پر مرکوز رہی، لیکن اس نے خود خانِ اعظم کا خطاب قبول کرنے سے احتراز کیا۔ باتُو نے ۱۲۵۵-۵۶ء میں وفات پائی۔ اس کا بھائی برکہ، جو اس کا جانشین ہوا، پہلا مغول شہزادہ تھا جس نے مذہب اسلام (طریقۂ اہل سنت) قبول کر کے تاتاریوں کو دائرۂ اسلام میں شامل کرنے کے کام کا آغاز کیا۔ اس عمل سے اس نے (ایران، چین اور وسط ایشیا کے ہم قوم قبائل کے برعکس) تاتاریوں کو خصوصیت کے ساتھ راسخ العقیدہ مسیحی مذہب کی پیرو روسی رعایا سے ممیّز کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں قوموں کے درمیان مکمل اختلاط اور اتحاد اب تک ممکن نہیں ہوا۔ برکہ نے مصر کے مملوک حکمرانوں سے بھی ایک معاہدہ کیا، جس کا اوّلیں مقصد ایران کے منگول ایلخانیوں [رک بآن] کے خلاف باہمی اتحاد تھا۔ یہ منگول ابھی تک شمنی یا بدھ مذہب پر قائم تھے اور انھوں نے ۱۲۵۸ء میں خلافت بغداد کے خلاف جنگ کر کے برکہ کی شدید دشمنی مول لے لی تھی۔ اس معاہدے کا اثر قرنہا قرن تک اردوے مُطلّا کی سیاست پر نمایاں رہا اور اس سلطنت کے اور ایلخانیوں کے درمیان متعدد جنگیں، بالخصوص کوہ قاف اور بحیرۂ خوارزم (بحیرۂ ارال Aral sea) کے نواح میں ہوتی رہیں۔ ان جنگوں کے دوران میں کوہ قاف کا علاقہ ایلخانیوں کے زیر اثر آ گیا۔ مصر کے مملوک حکمرانوں کے ساتھ اسی سیاسی معاہدے کے بعد مصر سے تجارتی لین دین بھی بہت تیزی کے ساتھ جاری رہا (مصر کے ممالیک کی بڑی تعداد اسی اُردوے مُطلّا کے علاقے سے جاتی تھی)۔ اس تجارت کا دارومدار اس بات پر تھا کہ مشرقی رومی یا بوزنطی سلطنت کے شہنشاہ کی جانب سے (جو ۱۲۶۱ء سے پیلیولوگس (Paleologus) خاندان کا فرد تھا) دوستی و خیر سگالی کا رویہ برقرار رہے، اس لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اس رومی شہنشاہ سے بھی ایک معاہدہ کیا جائے۔ رُوم [رک بآن] کے سلجوقی حکمرانوں سے بھی اسی طرح کے تعلقات قائم ہوئے۔ ان دوستانہ معاہدوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی اثرات، خصوصاً ترکی (سلجوقی اور مملوکی) ثقافتی اثرات اردوے مُطلّا تک پہنچ گئے۔ اس علاقے میں اثری تحقیقات

کی بدولت ہمیں والگا کے علاقے کے فُنون اور آلات کے بارے میں وسیع معلومات حاصل ہوئی ہیں (اس ضمن میں دیکھیے بالخصوص F. A. Balodis: *Alt- Sarai und Neu-Sarai: die Hauptstädte der Golden Horde*، در *Latvijas Universtātes raksti*، ج ۱۳، ریگا ۱۹۲۶ء، ص ۳- ۸۲)۔ روس میں تاتاریوں نے اپنے اختیارات کا استعمال بُسقاقوں (Baskaks) کے ذریعے خراج وصول کرنے یا چھوٹے امرا کی حیثیت کو تسلیم کرنے تک محدود رکھا، جن کے باہمی مناقشات ان کی بقا و تحفّظ کے ضامن تھے۔ روسی راسخ العقیدہ کلیسا، جسے تاتاریوں نے کچھ مراعات عطا کی تھیں، ان چھوٹے چھوٹے امرا کے مقابلے میں اپنی وحدت برقرار رکھنے میں کامیاب رہا اور اس طرح عام روسی افکار و تصورات کا مرکز بن گیا۔

برکہ کی وفات کے ساتھ اسلامی اثر کلیۃً ختم نہیں ہوا، اگرچہ اس کے تمام جانشین شمنی (Shamanist) مذہب کے پیرو رہے۔ سلطنت کی طاقت کو خانہ جنگیوں سے بھی نقصان پہنچا، جو شہزادہ نوخای (Nokhai) کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے لڑی گئیں۔ اس کامیاب سپہ سالار نے پولینڈ میں (۱۲۵۹ و ۱۲۸۶ء) اور کوہ قاف میں (۱۲۶۱- ۱۲۶۳ء) کامیابیاں حاصل کیں۔ یہ جنگیں ۱۲۹۹ء تک جاری رہیں۔ جب نوخای (دیکھیے نوگائی Nogai [=نوقا، دیکھیے جہاں گشا]) لڑائی میں مارا گیا تو آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں سیاسی صورت حال بدل گئی اس لیے کہ ایلخانیوں کے (جو اب مسلمان ہو چکے تھے) اور مصر کے باہمی معاملات اب زیادہ بہتر اور ہموار ہو گئے تھے۔ ۱۳۲۳ء میں [اردوے مُطلّا اور ایلخانیوں کے درمیان] ایک باضابطہ صلح نامے پر دستخط ہوے۔ اس صلح نامے کی بدولت اردوے مُطلّا اور مصر کے درمیان تجارتی تعلقات میں کمی پیدا ہو گئی۔ ۱۳۳۵ء میں ایلخانی سلطنت کے زوال کے بعد اردوے مُطلّا کو اوزبیگ خاں (۱۳۱۳- ۱۳۴۱ء) کی سربراہی میں پھر ایک اہم مقام حاصل ہو گیا۔ وہ خود مسلمان تھا اور اس نے واضح طور پر والگا کے علاقے میں اسلام کی بنیاد کو مستحکم کیا۔ اس کے بعد سب خان اسی مذہب کے پیرو رہے۔ والگا کے تاتاریوں کی غالب اکثریت اب اس اسلامی (سُنّی) مسلک و مشرب کی جانب زیادہ مائل ہوتی گئی، جس کا نمونہ ایشیاے کوچک میں موجود تھا اور جس کا اثر کریمیا میں خصوصیت کے ساتھ زیادہ نمایاں تھا۔ اوزبیگوں کا نیا قبیلہ، جو اسی اوزبیگ کے نام سے منسوب ہوا، اس ثقافت کے زیر اثر آ گیا۔

مغربی ملکوں کی جانب سے مسیحیت کی ترویج کی کوششیں (خصوصاً پوپ جان بست دوم (John XXII) کے ایما پر) اس ملک میں بیکار ثابت ہوئیں اور مذہبی جنگیں، جیسی اس وقت ایران میں جاری تھیں، اردوے مُطلّا کو متأثر نہ کر سکیں؛ تاہم مغربی مسیحیت کے چند مراکز، جو ان کوششوں سے وجود میں آ گئے تھے، کچھ عرصے تک قائم رہے۔ انھیں مرکزوں میں جنیوا کے لوگوں کی نوآبادیاں شامل تھیں، جو کریمیا [رک بآن] میں قائم ہوئیں (دیکھیے کَفّہ) اور جن کا آغاز ۱۳۶۵ء سے ہوا تھا۔ یہ نوآبادیاں تجارتی کاروبار میں بھی سرگرم تھیں اور فلانڈرس (Flanders) سے کپڑا اور یورپ کے دیگر ممالک سے چینی کے برتنوں (Ceramics) کی مصنوعات اور زیورات درآمد کرنے میں ''میان کار'' کا کام کرتی تھیں۔ ان اشیا کے مبادلے میں سمور، مچھلیاں اور غلہ خاص برآمدی اشیا تھیں۔

اوزبیگ خاں کے بیٹے جانی بیگ خان (۱۳۴۱- ۱۳۵۷ء) اور اس کے پوتے بردی بیگ خان (۱۳۵۷ - ۱۳۵۹ء) نے ۱۳۵۶ء سے ۱۳۵۹ء تک آذربیجان کو فتح کرنے کی جو کوششیں کیں ان سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ممکن ہے کہ اس میں ان کا مقصد یہ ہو کہ دردانیال کے راستے کو چھوڑ کر، جو ۱۳۵۴ء کے بعد عثمانی ترکوں کے قبضے میں تھا، شام سے ہوتے ہوے بحیرۂ روم تک پہنچنے کا کوئی راستہ نکال لیں۔ چونکہ یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکا، اس لیے اس عہد کے بعد اردوے مطلّا نے بتدریج مشرقی یورپ کی ایک بڑی طاقت کی حیثیت اختیار کر لی، جس کی بقا اب بڑی حد تک پولینڈ، لیتھونیا اور روس (Muscovy) کی بڑھتی ہوئی طاقتوں کے رحم و کرم پر منحصر تھی۔ حالات کی اس رفتار کو ۱۳۵۹ء کے بعد اس اندرونی اختلال و انتشار نے اَور بھی تیز کر دیا جو متعدّد مدعیانِ حکومت کی باہمی آویزشوں کا نتیجہ تھا۔ اسی کی بدولت ۱۳۸۰ء میں ڈون (Don) کے کنارے سنائپ (Snipe) کے میدان (Kuliovo pole) میں پہلی بار ایک روسی فوج نے تاتاری فوجوں کو، جن کی قیادت مامای (Mamai) کے ہاتھ میں تھی، شکست فاش دی۔ اس طرح ریاست مسکووی (Grand Duchy of Muscovy) نے، جسے اردوے مُطلّا نے آخری بار خراج جمع کرنے پر مامور کیا تھا اور جس کا گرینڈ ڈیوک کا خطاب موروثی ہو چکا تھا، اپنے آپ کو ایک نئی آزاد حکومت کی حیثیت سے مستحکم کر کے تمام روسی سرزمینوں سے خراج وصول کرنے کا منصب سنبھال لیا۔

آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اردوے مُطلّا کے حکمران تُقْتَمِیش [رک بآن] نے ساری سلطنت کو متحد کرنے کی کوشش کی، لیکن اسے تیمور کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ تیمور نے ۱۳۹۱ء میں اسے شکست دی اور ۱۳۹۵ء میں اسے فرار ہونا پڑا۔ تیمور نے شہر سرای کو تباہ کر ڈالا۔ اب سالار ایڈگو (Edigü) (روسی زبان میں Yedigey) اردوے مُطلّا کے اصلی حکمران کی حیثیت سے نمایاں ہوا۔ اس نے لیتھونیا کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کیا تھا اور ۱۳۹۹ء میں ورسکلا (Vorskla) کے مقام پر لیتھونیا کی فوجوں کو شکست دے کر ان کی پیش قدمی کو روک دیا تھا۔ اس کی موت ۱۴۱۹ء میں واقع ہوئی اور مرتے دم تک وہ سلطنت کی آزادی کی حفاظت کامیابی کے ساتھ کرتا رہا۔ اس کے بعد بالآخر سلطنت کا شیرازہ حقیقۃً بکھرنا شروع ہو گیا۔ انتشار کے اس عمل کو قازان [رک بآن]، اَستراخان [رک بآن] اور ۱۴۳۸ء میں کریمیا میں آزاد ریاستوں کے قیام نے اَور زیادہ تیز کر دیا۔ سلطنت کا بقیہ حصّے کے لیے جسے اب عام طور پر اردوے عظیم (Great Horde) کہا جاتا تھا، کیف کے مشرق کی

باتُو (خانوادہ)

شجرۂ خانوادۂ باتو

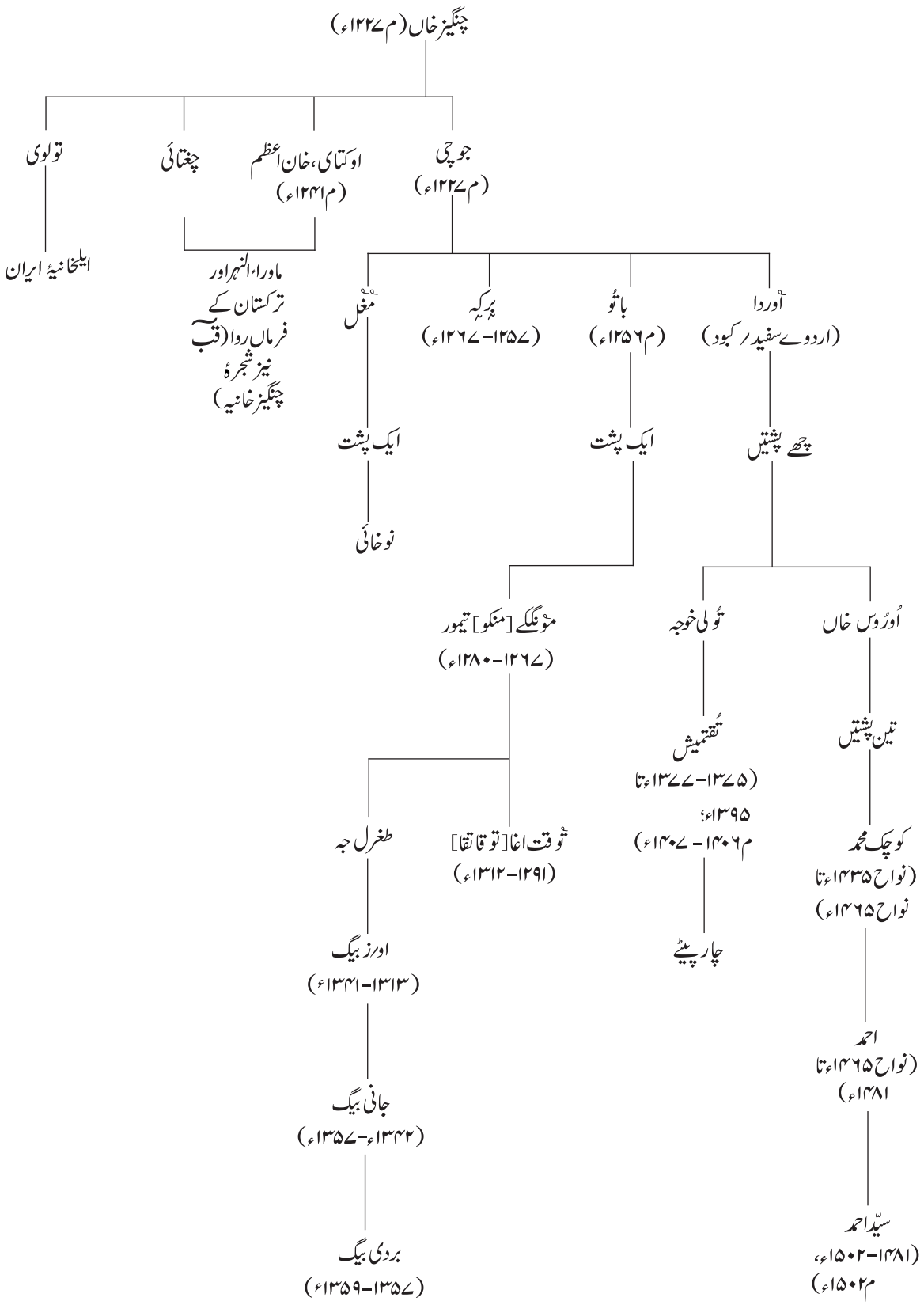

جانب اپنی حیثیت برقرار رکھنے کی صرف یہی صورت رہ گئی تھی کہ وہ مسکووی کے علاوہ (۱۹۶۶ء سے) پولینڈ اور لیتھونیا سے معاہدے کرلے، چنانچہ ۱۴۸۰ء میں یہ سلطنت پھر ایک بار اس قابل ہوگئی کہ ماسکو کے لیے خطرے کا باعث بن سکے؛ لیکن ۱۵۰۲ء میں اُردوے عظیم نے آخری بار فیصلہ کن شکست کھائی۔ اب اس کے حلیفوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور عثمانی سلطان نے (جو ۱۴۷۵ء میں اس کے بڑے حریف کریمیا کا سرپرست بن گیا تھا) اسے قانونی مجرم قرار دے دیا۔ آخر کار مسکووی (روس) اور کریمیا نے اس پر غلبہ حاصل کرلیا۔ قازان، استرا خان اور سائبیریا کی ریاستیں بھی سولھویں صدی میں ختم ہوگئیں۔

اردوے مُطلّا ہی وہ تنہا طاقت تھی جس نے خصوصاً مشرق کی جانب سے روس پر حقیقۃً قبضہ اور تسلّط حاصل کیا۔ تاتاری حکومت کا جُوا، جو اڑھائی صدی تک روسیوں کی گردن پر رہا، محض روس ہی کی تاریخ کا ایک اہم ترین دَور نہیں بلکہ پولینڈ اور لتھونیا کی تاریخ میں بھی اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کا نتیجہ والگا کے کناروں پر اور مغربی سائبیریا میں ترکی قبائل کی آبادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ان علاقوں میں اب بھی تاتاری عناصر بکھرے ہوے ملتے ہیں اور ان کی بقا کا سب سے مؤثر سبب ان کا اسلامی عقیدہ تھا۔

روسیوں پر تاتاریوں کے ثقافتی اثرات روس کی گزشتہ صدیوں کی تاریخ میں تلاش کیے جاسکتے ہیں اور روسیوں کے نظام حکومت، ان کے فوجی نظام، رسوم و آداب، اور راعی و رعایا کے تعلقات کے متعدد پہلوؤں میں یہ اثرات اس طرح نمایاں نظر آتے ہیں جس طرح ان کی زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں، بلکہ بعض حیثیتوں سے یہ موجودہ زمانے میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ غیر مذہب کے پیروؤں کے خلاف روس کے زاروں کی جنگوں نے روسی اور مشرقی سلافی قوموں کے سیاسی اور عوامی شعور پر بھی فیصلہ کن اثر ڈالا [رکّ بہ تاتار].

مآخذ: (۱) B. Spuler: *Die Goldene Horde*، لائپزگ ۱۹۴۳ء؛ (۲) وہی مصنّف: *Mongolenzeit*، لائڈن – کولون ۱۹۵۳ء (Hand der Orienta - listik، جلد چہارم، جزو دوم)؛ (۳) B. D. Grekov و A. Yu. Yakubovsky: *Zolotaya Orda i Yeyë Padenie* (اردوے مطلّا اور اس کا زوال)، ماسکو–لینن گراڈ ۱۹۵۰ء؛ (۴) A. N. Nasonov: *Mongoly i Ruś* (روس میں منگول)، ماسکو–لینن گراڈ ۱۹۴۰ء؛ (۵) J. von Hammer-Purgstall: *Geschichte der Goldenen Horde,* Pest ، ۱۸۴۰ء (اس کتاب پر بہت کچھ حک و اضافہ ہو چکا ہے)؛ (۶) P. Pelliot: *Notes sur l' Histoire de la Horde d' Or*، پیرس ۱۹۴۰ء (یہ تاریخی محاکمہ نہیں بلکہ تقریبًا بیس اعلام و مقامات پر تبصرہ ہے)؛ (۷) W. von. Tiesenhausen: *Materialy otnosjaščiesja k istorii Zolotoy Ordĭ* (مواد براے تاریخ اردوے مُطلّا)، ۲ جلد، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۸۴ء، جلد دوم ۱۹۴۱ء؛ C. M. Frähn: *Über die Münzen der chane vom Ulus Dschutschi's*، سینٹ پیٹرزبرگ و لائپزگ ۱۸۳۲ء، ان کتابوں میں اصل مآخذ کی فہرستیں اور مزید کتابیات بھی موجود ہیں۔

(B. SPULER)

- - - - - - - - - - - -

باتو خان: ایک منگول شہزادہ، روس کا فاتح اور اردوے مُطلّا (Golden Horde) ✱(۱۲۲۷-۱۲۵۵ء) کا بانی، تیرھویں صدی کے اوائل میں پیدا ہوا؛ وہ جوچی [= جوجی و چوچی و جوشی و توشی، قب جهان گشای جوینی] کا دوسرا بیٹا تھا۔ چنگیز خاں کی زندگی میں جُوچی کو، جو اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا، جاگیر (یُوری) کے طور پر وہ تمام حصّۂ ملک عطا ہوا تھا جو قیَالیق [قیالیغ] اور خوارزم کے علاقے سے لے کر سَقُسین اور والگا (Volga) کے کنارے پر بلغار تک اور "اس سمت میں اس حد تک جہاں تاتاری گھوڑوں کے قدم پہنچ سکے تھے" پھیلا ہوا تھا۔ اس وسیع علاقے کا مشرقی حصّہ، یعنی مغربی سائبیریا (Siberia)، موجودہ قازقستان اور سیر دریا کا طاسِ زیریں، جوچی کے مرنے پر ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء) اس کے بڑے بیٹے اوردا (Orda) کے حصے میں آیا اور مغربی حصّہ یعنی خوارزم اور بحیرۂ اسود کے شمال/شمال مغرب کی جانب دشتِ قپچاق [= قفچاق (جوینی، طبع براؤن)، قبجاق، قپچاق (جامع التواریخ، طبع ماسکو ۱۹۴۵ء)] یا قپچاق کا میدانی علاقہ) باتو خاں کو ملا۔

باتو خاں کے زمانۂ حکومت کے پہلے دس برسوں کے متعلق ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ اس قورلتای (مغول شاہزادوں کے اجتماع) میں موجود تھا جو ۶۲۶ھ/۱۲۲۹ء میں منگولیا میں منعقد ہوا تھا اور جس میں اوکتای [قاآن] کو خان اعظم منتخب کیا گیا تھا۔ وہ غالبًا ۶۳۲ھ/۱۲۳۵ء کے قورلتای میں بھی شریک تھا، جس میں روسیوں اور ان کی ہمسایہ اقوام کے خلاف ازسرِنو جنگ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی وہ مشرقی ایشیا میں نہیں آیا۔ ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء کے موسم بہار میں جو لشکر روانہ ہوا تھا اس میں چغتای (جغتای و جغاتای، دیکھیے جهان گشا و جامع التواریخ) اوکتای [جهان گشا] اور تُولی یا تولوی [تولوی، قب جامع التواریخ] کے بیٹے بھی شامل تھے، لیکن اس لشکر کا سالارِ اعظم باتو خاں تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مغول فوجیں اسی سال کے موسم خزاں میں والگا کے بلغاریوں (Volga Bulghars) کے علاقے میں پہنچ گئی تھیں، لیکن شہر بلغار کی تباہی ۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء کے موسم خزاں سے پہلے واقع نہیں ہوئی۔ [جس سال یہ واقعہ پیش آیا] اسی سال مغول اس علاقے میں جو اب روس کا جنوبی حصہ ہے قپچاق کے ترکوں کے خلاف جنگی مہموں میں مصروف تھے۔ ربیع الاول – ربیع الثانی ۶۳۵ھ/نومبر ۱۲۳۷ء میں اُنھوں نے دریاے والگا کو، جو منجمد تھا، عبور کیا اور روس کی ریاستوں پر حملہ کرکے متعدد شہروں پر یکے بعد دیگرے قبضہ کرتے چلے گئے، تا آنکہ رجب – شعبان ۶۳۵ھ/مارچ ۱۲۳۸ء تک نووگراڈ (Novogorod) کا راستہ ان کے لیے صاف ہو چکا تھا۔ مغول اس شہر سے پینسٹھ میل کے فاصلے تک پہنچ گئے تھے، لیکن بظاہر اس اندیشے سے کہ موسم بہار میں برف پگھلنے سے راستے ناقابل

گزر نہ ہو جائیں وہ دفعۃً جنوب کی جانب مُڑ گئے اور ایک طویل مدت تک دریاے ڈان (Don) کے طاسِ زیریں میں آرام کرنے اور ۶۳۶-۶۳۷ھ/۱۲۳۹ء میں کوہ قاف میں چھوٹی چھوٹی مہموں میں مصروف رہنے کے بعد آخر کار ۶۳۷ھ/۱۲۴۰ء میں انھوں نے روس کے خلاف جنگ کا آغاز ایک حملے سے کیا، جس کا خاتمہ اسی سال دسمبر میں کیف (Kiev) کی فتح پر ہوا۔ یُوکرین (Ukraine) سے بیک وقت پولینڈ اور ہنگری پر بھی حملہ شروع ہوا۔ پولینڈ سے گزرتے ہوے مغول سلیشیا (Silesia) میں گُھستے چلے گئے۔ انھوں نے Liegnitz کے مقام پر ۲۵ رمضان ۶۳۸-۶۳۹ھ/اپریل ۱۲۴۱ء کو ڈیوک ہنری دی پایس (Henry the Pious) کو شکست دی اور پھر موراویا (Moravia) میں سے گزرتے ہوے وہ اصل لشکر سے جا ملے، جس کی قیادت خود باتُو خاں کر رہا تھا۔ یہ لشکر کوہ کارپتھین کو عبور کر کے ہنگری میں داخل ہو چکا تھا۔ ۲۷ رمضان ۶۳۸ھ/۱۱ اپریل ۱۲۴۱ء کو موہی (Mohi) کے مقام پر اس لشکر نے ہنگری کی فوجوں کو شکست فاش دی۔ مغول فوجوں نے مجتمع ہو کر اس سال موسم گرما اور خزاں کا زمانہ ہنگری کے میدانوں میں گزارا۔ پھر عین کرسمس کے روز باتُو خاں نے اپنی فوج کے ساتھ منجمد دریاے ڈینیوب عبور کر کے استرغوں (Esztergon) کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ کا آخری بڑا معرکہ وہ مہم تھی جس میں مغول کروشیا (Croatia) اور ڈلمیشیا (Dalmatia) سے گزر کر ہنگری کے حکمران بیلا چہارم (Bela IV) کا تعاقب کرتے ہوے بحیرۂ ایڈریاٹک (Adriatic) کے ساحل تک پہنچ گئے تھے۔ اب مغول فوجیں مغربی یورپ پر حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھیں کہ ۵ جمادی الاُخرٰی ۶۳۹ھ/۱۱ دسمبر ۱۲۴۱ء کو خان اعظم (اوکتای Ogedey) کے مرنے کی خبر پہنچی اور باتو خاں نے اپنی فوجوں کو واپس بلانے کا فیصلہ کر لیا۔ بلقان کے راستے سے واپس ہو کر وہ آخر کار ۱۲۴۲ء کے اواخر میں زیریں والگا کے کنارے اپنے مستقر میں پہنچ گیا۔

یہی زمانہ تھا جب باتو خاں نے اُردوے مطلاّ کی بنیاد رکھی۔ ۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء سے ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء تک جن ملکوں پر مغول نے حملہ کیا تھا ان میں سے صرف روس ان کے قبضے میں رہ گیا تھا۔ اس سے پہلے ہی ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء-۶۴۱ھ/۱۲۴۳ء میں Vladimir کا گرینڈ ڈیوک یاروسلاف اول (Yaroslav I) حلف وفاداری اُٹھانے کے لیے باتو خاں کی لشکر گاہ (اردو) میں حاضر ہوا تھا اور باتو خاں نے اسے "سرآمدِ امراے اہل روس" کا اعزاز عطا کر کے اس کے مرتبے کی توثیق کر دی تھی۔ اسی طرح ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء میں گلیشیا (Galicia) کے شہزادے ڈینیل (Daniel) کو بھی اپنے منصب کی توثیق کے لیے باتُو کے سامنے اظہارِ اطاعت و وفاداری کرنا پڑا۔

اس زمانے میں باتو کی توجہ بڑی حد تک مشرقی ممالک [یعنی منگولیا اور ملحقہ ممالک] کے واقعات پر مرکوز رہی۔ ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء کے قورلتای میں اوکتای کا بڑا بیٹا گیُوک (Güyük)، جس کے ساتھ باتُو خاں کی ذاتی دشمنی تھی، اپنے باپ کی جگہ تخت پر بٹھا دیا گیا۔ تخت نشینی کی رسم کے موقع پر باتُو خاں کی نمائندگی اس کے پانچ بھائیوں نے کی تھی اور رشید الدین فضل اللہ کے بیان کے مطابق اس نے اپنے جسمانی عوارض کی بنا پر شرکت سے معذوری ظاہر کی تھی۔ ۱۲۴۸ء کے آغاز میں نیا خان اعظم قرَاقرم سے مغرب کی طرف روانہ ہوا۔ رشید الدّین [فضل اللہ] کے بیان کے مطابق اس نے یہ ظاہر کیا کہ اس کا ارادہ صحت کی بحالی کے لیے اپنی ذاتی جاگیر (یُوری) کی طرف جانے کا ہے، جو دریاے ایمل (Emil) [=ایمیل قبؔ جہان گشا] کے کنارے اس علاقے میں واقع تھی جو اب مشرقی قازقستان (Kazakhstan) کہلاتا ہے؛ لیکن تُولُوی کی بیوہ کو یہ شک گزرا کہ اس کا اصل ارادہ باتُو خاں پر حملہ کرنے کا ہے، چنانچہ اس نے باتُو کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔ گیُوک حالتِ سفر ہی میں قُم سِنگر (Kumsengir) کے مقام پر، جو بالائی اُورُنگو (Urungu) کے کنارے واقع ہے، اچانک مر گیا۔ یُوآن شِیہ (Yuan shih) کے بیان کے مطابق اس کی موت ۱۲۴۸ء کے تیسرے مہینے میں (۲۷ مارچ تا ۲۴ اپریل) واقع ہوئی۔ جُوینی اور رشید الدّین فضل اللہ کے بیانات اس بارے میں مختلف ہیں کہ گیُوک کی موت کے وقت باتُو کس مقام پر تھا۔ جُوینی کا بیان ہے کہ وہ خان کی دعوت پر اس سے ملنے کے لیے مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا جب الَاقماق (Ala-Kamak) [دیکھیے جہان گشا] کے مقام پر اسے خان کے مرنے کی خبر ملی۔ یہ مقام غالبًا کوہستان الَتاوَ (Alatau) میں اِلی (Ili) کے جنوب میں قیَالیق (Ḳayalïḳ) [=قیالیغ قبؔ جہان گشا] سے ایک ہفتے کی مسافت پر واقع ہے۔ باتُو نے اپنے گھوڑوں کے دُبلے اور کمزور ہونے کا عذر پیش کر کے مغول شہزادوں کو اس مقام پر ملنے کی دعوت دی۔ اس کے برعکس رشید الدّین فضل اللہ کے بیان کے مطابق یہ اجتماع باتُو کے اپنے علاقے میں ہوا تھا۔ اوکتای، چغتای اور گیُوک کے بیٹوں کے متعلق اس کا بیان ہے کہ اُنھوں نے دشتِ قپچاق کا طویل سفر کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

یہ اجتماع خواہ کہیں بھی ہوا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ باتُو کی تجویز پر تُولوی کے بڑے بیٹے مونگکے (Mongke) کو گیُوک کی جگہ خان اعظم تسلیم کر لیا گیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ اس کی تخت نشینی کی رسم اگلے سال منگولیا میں ایک قورلتای منعقد کر کے منائی جائے؛ لیکن یہ رسم ۹ ربیع الآخر ۶۴۹ھ/یکم جولائی ۱۲۵۱ء سے پہلے ادا نہ ہو سکی اور اس موقع پر باتُو کی نیابت اس کے بھائی برکہ [بن توشی بن چنگیز خان] نے کی۔ جس وقت یہ رسم منائی جا رہی تھی خان اعظم کے خلاف ایک سازش کا انکشاف ہوا، جس کی سرکردگی چغتای اور اوکتای کے خاندانوں کے شہزادے کر رہے تھے۔ ان شہزادوں میں سے اکثر کو سلطنت کے دور دراز حصّوں میں جلاوطنی کی سزا دی گئی۔ چغتای کا پہلا جانشین اور بیٹا یسُو (Yesü) [=منکو بن چغتای بن چنگیز خان] اور اس کا پوتا بوری (Büri) [=بن ماتیکان (مواتکان) بن چغتای] باتُو کے حوالے کر دیے گئے اور موخّر الذکر (بوری) کو، جس کا کسی حد تک باتُو اور گیُوک کی ذاتی مخاصمت سے بھی تعلق ظاہر ہوتا ہے، باتُو کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

اب ساری سلطنت عملی طور پر مونگکے (Mongke) [=منگو قاآن بن تولی

بن چنگیز خاں] اور باٹو کے درمیان بٹی ہوئی تھی۔ وِلیَم آف رُبُرُک (William of Rubruck) نے مُونگکے کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں جو اس نے ۶۵۱ھ/ ۱۲۵۴ء میں کہے تھے: ''جس طرح سورج اپنی کرنیں ہر جگہ پہنچاتا ہے اسی طرح میرا اور باٹو کا اقتدار ہر جگہ پہنچتا ہے''۔ رُبُرُک کے بیان کے مطابق ان کے علاقوں کی درمیانی حد تَلَیس (Tales) اور چُو (Ču) کے درمیانی میدانوں میں واقع تھی اور مُونگکے کی قلمرو میں باٹو کے لوگوں کا جتنا احترام کیا جاتا تھا اتنا باٹو کے علاقے میں مُونگکے کے لوگوں کو حاصل نہیں تھا۔ یہ امر یقینی ہے کہ ایک ممتاز چنگیزی شہزادے کی حیثیت سے اور نیز اس بنا پر کہ مُونگکے اپنی تخت نشینی کے لیے اس کا ممنون احسان تھا باٹو کو غیر معمولی عزت حاصل تھی۔ ان سرزمینوں میں بھی جو منگولوں کی آبائی قلمرو کی حدود سے باہر تھیں، مثلاً ماوراء النہر میں اسے بعض شاہانہ اختیارات حاصل تھے۔ جُوَینی کا بیان ہے کہ اس نے خُجند کی مدافعت کرنے والے تیمور مَلِک کے بیٹے کو باپ کی ریاست پر فائز کرکے اس کی توثیق کر دی تھی۔

رُبُرُک (Rubruck) کا بیان ہے کہ باٹو کی چھبیس بیویاں تھیں اور رشید الدّین کے بیان کے مطابق اس کے چار بیٹے تھے۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آخر عمر میں اس نے اپنے کچھ اختیارات اپنے بڑے بیٹے سرتاق (Sartak) [بن باٹو بن چنگیز خاں] کو تفویض کر دیے تھے، جو نسطوری عیسائی مذہب کا پیرو تھا۔ سرتاق ہی کو ۶۴۶-۶۴۷ھ/ ۱۲۴۹ء کے بعد روسی امرا اطاعت و وفاداری کی پیشکش کرتے تھے۔ تاریخی مآخذ میں باٹو کے مرنے کی تاریخ کے بارے میں بڑا اختلاف ہے، لیکن سب سے زیادہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وفات ۶۵۳ھ/ ۱۲۵۵ء میں ہوئی۔ رُبُرُک کے بیان سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اپنے عہدِ حکومت کے آخری برسوں میں وہ والگا کے مشرقی کنارے پر مقیم رہا۔ وہ گرمی کے موسم میں شمال کی سمت بڑھتا ہوا عرض البلد ۵۲ تک پہنچ جاتا تھا اور موسم سرما دریا کے دہانے کے قریب گزارتا تھا، جہاں اس نے اَستراخان سے پینسٹھ میل شمال کی سمت والگا کے ڈیلٹا کی ایک شاخ اَختُوبا (Akhtubea) کے کنارے شہر سرای (Sarai) کی بنیاد رکھی۔

باٹو کو، جسے روسی صرف ایک خونریز فاتح کی حیثیت سے جانتے ہیں، اس کے مغول ہمعصروں نے نیک یا عقلمند کا خطاب دیا تھا۔ جوزجانی [منہاج سراج] جیسا مصنّف بھی جو مغول کی موافقت میں کوئی تعصب نہیں رکھتا اسے ایک انصاف پسند اور باتدبیر حکمران بتاتا ہے۔ جُوَینی کے بیان کے مطابق اس کا رجحان کسی دین یا مذہب کی طرف نہ تھا بلکہ وہ اپنے آبا و اجداد کے طریقے کے مطابق آسمان کی پرستش کرتا تھا۔

مآخذ: جُوَینی: تاریخ جہان گُشا [متن طبع براؤن]، ترجمہ J. A. Boyle، ۲ جلد، مانچسٹر ۱۹۵۸ء؛ (۲) جوزجانی: طبقات ناصری [متن مطبوعۂ کلکتہ]، ترجمہ H. G. Raverty، لنڈن ۱۸۸۱ء؛ (۳) رشید الدّین فضل اللہ: جامع التواریخ، طبع E. Blochet، لائڈن ۱۹۱۱ء، [متن مطبوعۂ ماسکو]؛ (۴) Rubruck: *The Journey of William Rubruck to the Eastern Parts of the World*، ترجمہ W. W. Rockhill، لنڈن ۱۹۰۰ء؛ (۵) O. d'Ohsson: *Histoire des mongols depuis Tchinguiz-Khan Yusqu'a Timour Bey ou Tamerlan*، چار جلد، ہیگ اور ایمسٹرڈم ۱۸۳۴ء؛ (۶) V. V. Barthold: *Four Studies on the History of Central Asia*، جلد اول، ترجمہ V. L. T. Minorsky، لائڈن ۱۹۵۶ء؛ (۷) R. Grousset: *Empire des L' Steppes*، پیرس ۱۹۳۹ء و *L' Empire Mongol 1er Phase*، پیرس ۱۹۴۱ء؛ (۸) B. Spuler: *Die Goldene Horde*، لائپزگ ۱۹۴۲ء؛ (۹) G. Vernadsky: *The Mongols and Russia*، نیوہیون ۱۹۵۹ء۔

(W. BARTHOLD و [J. A. BOYLE])

⊗ **باتھرسٹ**: (Bathurst) مغربی افریقہ کے ملک گمبیا (Gambia) [رکّ بآن] کا صدر مقام اور بندرگاہ۔ ۱۸۱۶ء میں، جب گمبیا برطانوی نوآبادی تھا، یہ شہر بسایا گیا اور اس وقت کے وزیرِ نوآبادیات ارل آف باتھرسٹ کے نام سے اسے موسوم کیا گیا۔

باتھرسٹ دریائے گمبیا کے دہانے پر جزیرۂ سینٹ میری میں واقع ہے اور اندرون ملک سے ایک پل کے ذریعے ملا ہوا ہے۔ یہ ایک خاصا خوب صُورت شہر ہے۔ اکثر عمارتیں سمندر کے رخ بنی ہیں، جن کی تعمیر میں زیادہ تر سنگِ سرخ سے کام لیا گیا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا بہت خوشگوار ہے البتہ کبھی کبھی برسات میں موسم تکلیف دہ ہو جاتا ہے (۱۹۶۵ء میں یہاں پچاس انچ بارش ہوئی تھی)۔

باتھرسٹ سے ملک کے دوسرے حصوں تک سڑک اور دریا دونوں کے ذریعے آمد و رفت ہوتی ہے۔ یہاں سے سترہ میل کے فاصلے پر یُندم (Yundum) کا ہوائی اڈا ہے، جہاں بین الاقوامی کمپنیوں کے طیارے ٹھیرتے ہیں۔ دوسرے مدارس کے علاوہ باتھرسٹ میں ایک پیشہ ورانہ تربیتی مرکز بھی ہے، جہاں لکڑی اور دہات کا کام سکھایا جاتا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں یہاں ریڈیو سٹیشن قائم ہوا۔

یہاں کی آبادی، جو زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل ہے، ۱۹۶۳ء میں ۲۷۸۰۹ تھی۔

مآخذ: (۱) *Encyclopaedia Britannica*، ۱۹۵۰ء، ۹: ۹۹۷؛ (۲) *The World Almanac 1967*، مطبوعۂ نیو یارک، ص ۶۱۹؛ (۳) *Whitaker's Almanac 1967*، مطبوعۂ لنڈن، ص ۷۴۱؛ (۴) *The Statesman's Year-Book 1966-67*، ص ۵۵۶؛ (۵) *World Muslim Gazetteer*، مطبوعۂ کراچی، ص ۵۳۲؛ (۶) محمود بریلوی: *Islam in Africa*، لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۴۰۳۔

(سیّد امجد الطاف)

✱ اَلْبَاتِیہ: رکّ بہ علم نجوم۔

Urdū
Encyclopaedia of Islām

Under the Auspices

of

Department of Urdū Encyclopaedia of Islām

THE UNIVERSITY OF THE PUNJAB

LAHORE

Nasta'līq Edition

Vol. II

(Arghūn — Al-Bātia)

First Print: 1439 / 2017

جملہ حقوق بحقِ دانش گاہِ پنجاب محفوظ ہیں

مقالہ نگار یا کسی اور شخص کو کلی یا جزوی طور پر اس
کا کوئی مقالہ یا تعلیقہ یا اس کے کسی حصّے کا ترجمہ
شائع کرنے کی اجازت نہیں ہے